آتش و نم

نشور واحدی

کتاب محل

آتش و نم

نشور واحدی

پہلا اڈیشن۔ سنہ ۱۹۴۶ء

کتبہ
وحشت رقم دیوان آنند ذوقی برن تلہ الہ آباد

پرنٹرز و پبلشرز کتاب محل الہ آباد



حافظ احمد اللہ صاحب مرحوم

انتساب

محبِ ملّت حافظ احمد اللہ کانپوری مرحوم و
مغفور کے پُر جوش انقلابی تصوّرات کے نام ـــــ
حیاتِ شعری کی ابتدا تھی کہ مرحوم سے میری
ملاقات ہوئی۔ برسوں ساتھ رہا۔ میری شاعرانہ
آزادروی کے رُجحانات کے وہ سب سے پہلے اور پُرزور
موید تھے۔ آزادیِ افکار اور جرأتِ گفتار اُنکا خاص
جوہر تھا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

نشور واحدی

ب

صہبائے ہند

جناب نشور واحدی کا سب سے پہلا مجموعۂ کلام

جو

تخئیل اور طرزِ ادا کے لحاظ سے بالکل ایک نئی چیز ہے
حقیقت نگاری اور عمیق فلسفیانہ تفکرات

کا

بہترین کارنامہ ہے

ملنے کا پتہ

دانش محل، لکھنؤ

سنہ ۱۹۴۶ء

فہرست

شبنم و گل — صفحہ

مقدمہ

از فراقؔ گورکھپوری

نشورؔ واحدی کے کلام کا یہ مجموعہ بڑی خوبصورت شاعری کی مثال ہے۔ یہ نظمیں صرف اچھی نہیں بلکہ بہت اچھی ہیں۔ موجودہ دَورِ زندگی کی پُرخلوص ترجمانی اِن نظموں میں کی گئی ہے۔ لیکن دَورِ حاضر یا گزشتہ ادوار کے کسی مشہور شاعر کا منھ اِن نظموں میں نہیں چڑھایا گیا ہے۔ نقّالی کی پرچھائیں تک اِن نظموں پر نہیں پڑتی نشورؔ کا تخیّل نازک بھی ہے اور صحت بخش بھی ہے۔ ان کی درد بھری آواز میں نرمی بھی ہے ترنم بھی ہے اور توانائی بھی ہے۔ ان میں سے کئی نظمیں تو ہندوستان میں بجا طور پہ مشہور ہو چکی ہیں۔ جو لوگ اِن نظموں کو پڑھیں گے وہ یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ نشورؔ کے تخیّل اور وُجدان میں ایک ایسی گنگناہٹ ہے جس کے تموّج کی لکیریں انفرادی خد و خال رکھتی ہیں۔ نشورؔ کی رفتارِ خیال میں وہ نرم روی ہے اور اُس کی آوازِ پا میں وہ جھنکار ہے جسے ہم فردوسِ گوش و نظر کہہ سکتے ہیں۔ آواز کی یہ حلاوت اور

اور گھلاوٹ نشور کی بالکل اپنی چیز ہے جس پر نشور بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔

میں "آتش و نم" کی چند نظموں کے کچھ ٹکڑے جستہ جستہ آپ کو سناؤں گا۔ لیکن ایک بات شاید کہنے سے رہ جائے اس لئے ابھی کہے دیتا ہوں۔ سنئے غزل کی اور بات ہے۔ اگرچہ غزل میں بھی یہ توفیق بہت کم متغزلین کو ہوئی ہے کہ وہ اپنے اشعار سے اپنی شخصیت کی اچھائی اور نیکی کا ہمیں احساس کرائیں۔ علاوہ اپنی فنّی صلاحیتوں کا احساس کرانے کے'۔ لیکن نظموں میں تو یہ بات اور بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ نظموں میں عموماً خارجیّت کے عناصر غلبہ پا جاتے ہیں۔ اور لبا اوقات داخلیّت دب کر رہ جاتی ہے۔ آپ اگر صرف یہ محسوس کرنے کے لئے کہ شاعر کتنا نیک انسان ہے نظموں کا کوئی مجموعہ اٹھالیں تو آپ کی جستجو کو آسانی سے تشفّی نہ ہوگی۔ زورِ بیان۔ قدرتِ اظہار۔ رنگینی۔ تشبیہہ و استعارے۔ قوت مصوّری غرض کہ قادر الکلامی اور تخیّل کی رنگا رنگی اور تکمیلِ فن کی تو مسلسل نظموں میں کئی مثالیں آپ کو مل جائیں گی۔۔ دردِ محبت اور دردِ انسانیت کا بھی نہایت شدّ و مد سے اظہار کئی نظموں میں نظر آئے گا۔ اگر نہیں ملے گی یا بہت کم ملے گی تو وہی ایک بات یعنی شاعر کے بہت نیک بہت اچھا انسان ہونے کی شہادت۔ نظموں میں معصوم شخصیت کی جھلک دکھا دینا بہت کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے۔ اب سنئے نشور کی نظموں کے چند ٹکڑے اور دیکھئے کہ کئی دیگر شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ انھوں نے اپنی شرافتِ نفس کے عناصر بھی کس طرح اپنے نغموں میں سمو دیئے ہیں۔

"فضائے گیتی" چھ اشعار کی ایک مختصر نظم ہے اور نشور کے کلام کی بہت سی خوبیوں کی آئینہ دار ہے۔ اسی نظم سے "آتش و نم" کا ساز شاعر نے چھیڑا ہے۔

دھواں چھایا ہوا تھا نور کا تا اوجِ امکانی
کہ مجھ کو دُور سے آئی نظر مٹی کی تابانی

ستارے آرزوئے شوق کے پلکوں سے یوں ٹوٹے
کہ ان کی ضَو سے روشن ہو گئی دنیائے انسانی

گناہِ زیست نے رکھا قدم جس آستانے پر
حقیقت نے اُسی چوکھٹ پہ رکھی اپنی پیشانی

مگر نزدیک سے دیکھا تو عبرت ناک تھا منظر
کہ ظلمت نے پہن رکھا تھا ملبوسِ درخشانی

رُخِ مہتاب مفلس کی جوانی کی طرح پھیکا
شعاعِ مہر نے دہشت سے چادر رات کی تانی

یہ دنیا ہو نہیں سکتی منوّر اب ستاروں سے
اسے روشن کرو یا پھونک دو دل کے شراروں سے

دوسری نظم "میرے لئے کیا ہے کچھ بھی نہیں" کے صرف دو بند سنئے:-

یہ گاؤں کا منظر سناٹا اور شام کی دھندلی تاریکی
اک شام بہت رنگین مگر مفلس کی نگاہوں میں پھیکی
دھرتی پہ یہ پانی سونے کا آکاش پہ نہریں چاندی کی
یہ چاند یہ تارے یہ دریا میرے لئے کیا ہے کچھ بھی نہیں

یہ شہر کی چلتی سڑکوں پر ہر سمت دکانیں نورانی
بجلی میں بھی کھلتا ہو جیسے افلاس کے پتّے کا پانی
چہروں کی گرانی میں شامل غربت کے لہو کی ارزانی

یہ ساز یہ سامانِ عشرت میرے لئے کیا ہے کچھ بھی نہیں

ایک نظم کا عنوان ہے "مسافر" اس کا ایک بند سنئے :-

شاد کر سکتا نہیں طرزِ سکونِ دل مجھے سیر پیہم میں ہے کچھ ذوقِ نظر حاصل مجھے
اب سُلا سکتا نہیں افسانۂ منزل مجھے یادِ منزل لوٹ جا

آجکل کے بہت سے شعراء "پلٹ جا" کی جگہہ پر "لوٹ جا" لکھنے لگے ہیں۔ لیکن میں 'پلٹ' کو 'لوٹ' پر ترجیح دیتا ہوں۔

'ناداروں کی عید" چار دانگ ہندوستان میں مشہور نظم ہے۔ اس لئے اس سے کچھ اقتباس میں نہیں دیتا۔ اس نظم کو پڑھئے اور اپنے سینے میں وہ ٹیس اور کسک محسوس کیجئے جو انسانیت کی سب سے بڑی دولت ہے۔ رات کے عنوان سے شاعر کی ایک نظم ہے جس کا صرف پہلا بند سنئے اور رات کی رمزیت میں بھول جائیے۔

شام کی چڑیوں کی خاموشی فضاؤں کا سکوت
گو کبھی تھی ترنم زا ہواؤں کا سکوت
دن کے آتش بار قاہر دیوتاؤں کا سکوت
ایک عنواں ہے ترے افسانۂ خاموش کا

"خون میں پانی" جس نظم کا عنوان ہے اُس کا اُٹھان دیکھئے :-

دھوکا ہے خیالِ آزادی پیغام زبانی جب تک ہے
شیروں کا سر مغرور یہاں روباہِ کہن سے نیچا ہے

زندوں کا لباسِ تن بھی یہاں مُردوں کے کفن سے نیچا ہے
کہسارِ ہمالہ کا سر بھی توہینِ وطن سے نیچا ہے
اک داغ ہے یہ تاریخِ ستم دنیا کی کہانی جبتک ہے

"حسنِ ناتمام" بیک وقت کتنی مفکرانہ اور کتنی مترنّم نظم ہے۔ اس کا اندازہ بھی صرف چار مصرعوں سے کیجئے۔

بدلا نہیں نظام ابھی صبح و شام کا ۔۔۔ خاکہ کھنچا نہیں ابھی تخلیقِ تام کا
ہے انتظارِ فیصلۂ خلقِ عام کا ۔۔۔ قدرت نے جیسے روک لیا ہے قلم ابھی

اہرمن کے تصور کو سجاد حیدر مرحوم اور ڈاکٹر اقبالؒ نے اردو ادب میں بڑی اہم جگہہ دی۔ بلکہ شیطان کے تصور کی نشاۃِ ثانیہ ان کے قلم سے ہوئی۔ اہرمن کے عنوان سے نشور واحدی کی نظم یوں شروع ہوتی ہے:-

یہ بزمِ عیش و عشرت ننگِ امکاناتِ ہستی ہے
ہمہ تذلیلِ صہبا ہے ہمہ توہینِ مستی ہے
زمیں پر آسمانِ ماہ سے لعنت برستی ہے
یہ عالم ہے کہ انساں ایک جرمِ خود پرستی ہے

ہمیں اب انتقامِ سعیِ نافرجام لینا ہے
ہمیں اس دور میں شیطان سے کچھ کام لینا ہے

اِس نظم کے بعد اِس مجموعہ میں ایک نظم کا عنوان ہے "یزداں سے خطاب" یہ بڑی گہری

نظم ہے۔ مسئلۂ ارتقاء اور فلسفۂ تغیر کو جس ہلکے پھلکے اور گہرے انداز میں شاعر نے پیش کیا ہے وہ دیکھنے کی چیز ہے۔ دیکھنے کی نہیں بلکہ حقیقت میں ڈوب جانے کی دعوت یہ نظم دیتی ہے۔ اقبالؒ کی ایک مشہور نظم کا شعر ہے :۔

ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اسکی　　　وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہو جسکی

اِس شعر میں دنیا کی ماہیت بتائی گئی ہے۔ اپنی متذکرہ بالا نظم میں نشورؔ نے ایک ایسا گہرا شعر کہہ دیا ہے جس کی مثال فلسفیانہ شاعری میں ذرا آسانی سے نہ ملے گی۔ یزداں سے شاعر کہتا ہے :۔

تو پابندِ حیاتِ دائمی ہے ہر زمانے میں　　　مگر قادر ہے مٹنے پر بھی نقشِ جاوداں میرا

اس کے بعد "انسان" نشورؔ کی اگلی نظم کا عنوان ہے جس کا صرف ایک شعر سنئے :۔

نمودِ صد ملل میں ایک ہی انساں نمایاں ہے　　　یہ پیراہن ہزاروں چاک رکھ کر اک گریباں ہے

جس نظم کا عنوان انقلابی ہے وہ بڑی بلند پایہ نظم ہے۔ نظم کا اٹھان یوں ہوتا ہے :۔

تعیش میرے آگے بھول جاتا ہے ادا کاری

مری کشتِ بقا میں خونِ دل کرتا ہے گلکاری

مرا مسلک ہے تیغِ خود سری اور دستِ ہشیاری

میں فطرت سے لچک صہبا سے مستی چھین لیتا ہوں

میں اچھی طرح سوچ سمجھ کر پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ "آتش و نم" میں شامل شدہ کلام تمامتر انتخاب ہے۔ میں نشورؔ کے متموّج اور مترنم تخیل کا ذکر کر چکا ہوں

جس کی رنگا رنگ مثالیں اِس کتاب میں شروع سے آخر تک ملیں گی۔ لیکن اِن نغمات کو محض سارنگی یا بالسری کا لہرا سمجھ لینا یا ستار کی گت سمجھ لینا کافی نہیں ہے۔ نشور کی فکریات میں ایک سنجیدگی ہے اور ان کے شعور میں ایک خاموش تلخی ہے جو دورِ حاضر کی زندگی کے پُرخلوص اور حساس تجربہ کا نتیجہ ہے۔ اِن کی نظموں میں بسا اوقات خاموش اچانک پن کے ساتھ ایک بھیانک کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ ان نظموں میں تلخی اور غم کے ایسے جوہر ملتے ہیں جو دماغی یا جذباتی تعیش کی پیداوار نہیں ہے۔ بلکہ جو سنجیدہ تفکر اور ناقدانہ احساس سے اُبھتے ہیں۔ یہ نظمیں محض ضیافتِ سماع نہیں ہیں بلکہ دعوتِ نظر بھی ہیں اور سستی لذتیت سے یہ نغمے یکسر مبرّا ہیں۔

اِن نظموں کی تکنیک میں تھکا دینے والا اکہرا پن نہیں ہے۔ مقفّیٰ، مردّف نظموں میں غیر معمولی تازگی اور نیا پن ہے۔ اِن نظموں کی تخلیق و تعمیر میں ڈھیلا پن اور پھسپھسا پن نہیں ہے، رطب و یابس نہیں ہے، جھول نہیں ہے، ژولیدگی نہیں ہے، ناہمواری نہیں ہے، تخیل و ترنم کی کمی کی تھکاوٹ یا کمزوری کے آثار نہیں ہیں۔ دورِ حاضر کی نظم میں غیر مقفّیٰ شاعری یا آزاد نظم کے جتنے اور جیسے تجربے کئے گئے ہیں ان کی بھی بہت مثالیں اس مجموعہ میں ملتی ہیں جو پڑھنے والے کو چونکاتی ہیں لیکن جن سے شاعری کی تکنیک سے متعلق مذاقِ سلیم کی نبضیں نہیں جلتیں اور نہ جن سے کان کے پردوں کو ناخوشگوار چوٹ لگتی ہے۔ یہاں بھی نشور نے خوش آہنگی اور ترنم کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ طرزِ نو کی اِن نظموں میں بھی خیال اور آواز کے سانچے شاعر نے خود ڈھالے ہیں۔ طرزِ بیان اور

طرزِ خیال اور نظموں کی اسکیم یا چربہ اپنے کسی ہمعصر کے یہاں سے نہیں چراتے ہیں۔ نشور شاعر اُسے نہیں سمجھتے کہ کسی بڑے سے بڑے شاعر کی آواز سے اپنی آواز ملا دے یا اُس کی آواز میں اپنی آواز گم کر دے یا اُس کی آواز کا منھ چڑھاتے۔ نئے انداز کی شاعری نشور نے کیسی کی ہے اس کی صرف ایک مثال دیکھئے۔ نظیر اکبر آبادی کی روٹی والی نظم اپنی جگہہ شاہکار ہے۔ "روٹی" کے عنوان سے نشور اپنی نظم یوں شروع کرتے ہیں:-

زندگی یہ ہے کہ روٹی کو پکڑ دانت سے تو۔
اور خاطر میں رہے دولتِ آقا کا مزاج
ایک مٹھی یہ اناج
بیش قیمت ہے تری زیست کے ادراک سے بھی
جذبۂ پاک سے بھی

اِس مجموعہ کے آخری پچاس صفحوں میں نشور کی غزلیں ہیں جو خیال کی پستی اور بیان کی کمزوری سے یکسر پاک ہیں اور جو سنجیدہ تغزّل کی اچھی مثالیں ہیں۔ ان غزلوں میں کہیں کہیں نرمیت کی جھلک بھی آگئی ہے لیکن بہت ہلکی اور خوشگوار قسم کی۔ چند اشعار سنئے:-

حقیقت جس جگہہ ہوتی ہے تابانی بتاتی ہے — کوئی پردے میں ہوتا ہے تو چلمن جگمگاتی ہے
پیمانہ بکف ساتھ تمھارے نکل آئے — ہنگامۂ ہستی سے کنارے نکل آئے
گلِ رنگیں یہ کہتا ہے کہ کھلنا حسن کھونا ہے — مگر غنچہ سمجھتا ہے نکھرتا جا رہا ہوں میں

کتنا عجیب تر ہے یہ ربطِ زندگانی ہستی تمام شعلہ عالم تمام پانی

محبت اک مسلسل بدظنی معلوم ہوتی ہے کہ اُن سے ہر ملاقات آخری معلوم ہوتی ہے،

نشور کی شاعری کہیں سے نہ بے رنگ ہے نہ بدرنگ وہ چھوٹی باتیں یا اوچھی باتیں نہیں کہتے۔ وہ زندگی کا دامن مضبوطی سے اپنی مٹھی میں پکڑے ہوئے ہیں اور یہی دامن جب لہراتا ہے تو شاعری کی قوسِ قزح بن جاتا ہے۔ وہ اپنی شاعری کو بکواس نہیں ہونے دیتے۔ یہ نہیں کہ ان کے یہاں ہلکے اشعار نہ ہوں۔ لیکن یہ ہلکے اشعار بھی نشہ کے اُتار کا حسن رکھتے ہیں۔ شاعری میں نشور کی راہ روک دینے والی تکمیل کی بجائے نشور کے لئے کئی راستے کھول دینے والے امکانات نظر آتے ہیں۔ اِن کا رنگِ شاعری اس کا پتا دیتا ہے کہ ابھی اِسے اور اُجاگر ہونا ہے۔ نشور صحیح معنوں میں ترقی پسند شاعر ہے۔ اور شاعری میں ترقی پسندی کی تحریک کو وہ اپنے خلوص کے سہارے آگے بڑھنے میں مدد دے رہے ہیں نہ کہ محض چند نعرے لگا کر کہتے ہیں :۔

نشور اک زندگی کا تجربہ ہے شعرِ موزوں بھی
بہت دیکھے غمِ ہستی تو تھوڑی شاعری آئی

مجھے محض امید نہیں یقین ہے کہ یہ مجموعہ ترقی پسند ادب میں ایک گراں بہا اضافہ بھی ہے اور ایک شگون بھی ہے۔ نشور کی شاعری محض شکایتِ زمانہ نہیں ہے، بلکہ زندگی کے امکانات اور نئے آفاق کی طرف اشارے بھی کرتی ہے۔ نشور زندگی پہ طنز بھی کرتے ہیں اور زندگی پہ ایمان بھی رکھتے ہیں۔

آج جو شہرت نشور کو حاصل ہے "آتش و نم" کی اشاعت کے ساتھ وہ چوگنی ہو جائے گی۔ میں نشور کو جانتا ہوں اور اسی وجہ سے یہ بھی جانتا ہوں کہ شہرت اور ناموری سے وہ بے نیاز سہی، لیکن شہرت و ناموری سے اُن کا سر نہ پھرے گا۔ کیونکہ وہ آدمی ہیں نہایت سمجھ دار۔

بہر حال "آتش و نم" وہ مجموعہ ہے جو بلغمی بدن کے کئی موٹے تازے مجموعوں پر بھاری ہے۔

بلینک روڈ، الہ آباد
یکم جولائی ۱۹۴۶ء

فراق گورکھپوری

دیا خاموش ہے لیکن کسی کا دل تو جلتا ہے
چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے

فضائے گیتی

دھواں چھایا ہوا تھا نور کا تا اوجِ امکانی
کہ مجھ کو دور سے آئی نظر مٹی کی تابانی
ستارے آرزوئے شوق کے پلکوں سے یوں ٹوٹے
کہ ان کی ضو سے روشن ہو گئی دنیائے انسانی
گناہِ زیست نے رکھا قدم جس آستانے پر
حقیقت نے اسی چوکھٹ پہ رکھی اپنی پیشانی
مگر نزدیک سے دیکھا تو عبرتناک تھا منظر
کہ ظلمت نے پہن رکھا تھا ملبوسِ درخشانی
رخِ مہتاب مفلس کی جوانی کی طرح پھیکا
شعاعِ مہر نے دہشت سے چادر رات کی تانی
یہ دنیا ہو نہیں سکتی منور اب ستاروں سے
اسے روشن کرو یا پھونک دو دل کے شراروں سے

شرارے

میرے لئے کیا ہے کچھ بھی نہیں

یہ گاؤں کا منظر سناٹا اور شام کی دھندلی تاریکی
اک شام بہت رنگین مگر مفلس کی نگاہوں میں پھیکی
دھرتی پہ پاپی سونے کا آکاش پہ نہریں چاندی کی
یہ چاند یہ تارے یہ دریا میرے لئے کیا ہے کچھ بھی نہیں

یہ شہر کی چلتی سڑکوں پر ہر سمت دکانیں نورانی
بجلی میں بھی جلتا ہو جیسے افلاس کے پتے کا پانی
چیزوں کی گرانی میں شامل غربت کے لہو کی ارزانی
یہ ساز یہ سامانِ عشرت میرے لئے کیا ہے کچھ بھی نہیں

راتوں کے اندھیرے میں جگمگ جگمگ یہ فضا میخانوں کی
میٹر ول پہ نظارے مستی کے بہکی ہوئی لے دیوانوں کی
بوتل کی نوائے قلقل میں ہلکی سی کھنک پیمانوں کی
یہ شیشہ یہ ساقی یہ صہبا میرے لئے کیا ہے کچھ بھی نہیں

سڑکوں پہ حسینوں کا تانتا جادو کا پرا چپلتا پھرتا
ساری کی لپیٹوں سے جن کی چھلکے ہے جوانی کی صہبا
مستی کے قدم سنبھلے سنبھلے آنچل کا سرا ڈھلکا ڈھلکا
یہ حسن و جوانی رنگ و ادا میرے لئے کیا ہے کچھ بھی نہیں

آنکھوں پہ مری احسان ہے کیا سبزوں پہ اگر ہے برنائی
کیوں پوچھنے جاؤں کیاری میں پھولوں کا مزاج رعنائی
کیا کام ہے مجھ کو گلشن سے کلیاں ہوں کھلی یا مرجھائی
یہ پھول یہ شبنم سیر و فضا میرے لئے کیا ہے کچھ بھی نہیں

کالج کی یہ تعمیرِ خنداں ممنونِ غم و آلام نہیں
اس میں کسی مفلس کے گھر کے غمگین بسر کا نام نہیں
سامانِ تجارت ہے یہ بھی سامانِ مفادِ عام نہیں
یہ علم یہ حکمت ہوشربا میرے لئے کیا ہے کچھ بھی نہیں

بے جان ہو جب نقشِ ہستی تصویرِ تمنا کیا ہو گے
تاراج کے خونیں پنجے میں تہذیب کی مینا کیا ہو گے
چیلوں کے نجاست خانے میں بیچارہ پپیہا کیا ہو گے
یہ نغمہ یہ شعر و ساز و نوا میرے لئے کیا ہے کچھ بھی نہیں

مسافر

تیرے پیچھے اُڑ رہا ہے یادِ ماضی کا غبار
ڈھونڈتی ہے تجھ کو رنگا رنگیِ بزمِ نگار
تیرا دامن تھامتی ہے نکہتِ گیسوئے یار

اے مسافر ٹھیر جا

ہے خزاں کے دوش پر بکھری ہوئی زلفِ چمن
لالہ خونِ آرزو گُل ایک چاکِ پیرہن
لوٹتی آتی ہے گردِ راہ میں بوئے چمن

اے مسافر ٹھیر جا

یہ بیاباں، یہ ہوائے تُند، یہ ویرانیاں
رہ نوردی کی تھکن غربت کی بے سامانیاں
ذہن کی درماندگی اور زیست کی یکسانیاں

اے مسافر ٹھہر جا

جال بن سکتے نہیں زلفوں کا اب میرے لئے
خانۂ ویراں ہے بزمِ روز و شب میرے لئے
خندۂ تعبیر ہے خوابِ طرب میرے لئے

یادِ رنگیں لوٹ جا

شاد کر سکتا نہیں طرزِ سکونِ دل مجھے
سیرِ پیہم میں ہے کچھ ذوقِ نظر حاصل مجھے
اب سلا سکتا نہیں افسانۂ منزل مجھے

یادِ منزل لوٹ جا

گرد کے ذروں میں صحرا دیکھتا جاتا ہوں میں
ہر سرابِ غم میں دریا دیکھتا جاتا ہوں میں
ہر قدم پہ ایک دنیا دیکھتا جاتا ہوں میں

عیشِ دنیا لوٹ جا

ناداروں کی عید

زردار نمازی عید کے دن کپڑوں میں چمکتے جاتے ہیں
نادار مسلماں مسجد میں جاتے بھی ہوئے شرماتے ہیں
ملبوس پریشاں دل غمگیں افلاس کے نشتر کھاتے ہیں
مسجد کے فرشتے انساں کو انسان سے کمتر پاتے ہیں
قرآں سے دھواں سا اُٹھتا ہے ایمان کا سر جھک جاتا ہے
تسبیح سے اُٹھتے ہیں شعلے سجدوں کو پسینہ آتا ہے

ہو واسطہ جس کو فاقوں سے روزے وہ بچارا کیا رکھے
دن دیکھ چکا شب دیکھ چکا قسمت کا سہارا کیا رکھے
خالی ہوں لہو سے جس کی رگیں وہ دل کا شرارا کیا رکھے
ایمان کی عزت دیں کا بھرم افلاس کا مارا کیا رکھے

تاریک دکھائی دیتی ہے دنیائے مہ و خورشید اُسے
روزی کا سہارا ہو جس دن وہ روز ہے روزِ عید اُسے

اک مادرِ مفلس عید کے دن بچوں کو لئے بہلاتی ہے
سر اُن کا کبھی سہلاتی ہے نرمی سے کبھی سمجھاتی ہے
قسمت پہ کبھی جھنجلاتی ہے جینے سے کبھی تنگ آتی ہے
تہوار پڑوسن خوش ہو کر سب دیکھتی ہے اور کھاتی ہے

پیسے کا پجاری دنیا میں سچ پوچھو تو انساں ہو نہ سکا
دولت کبھی ایماں لا نہ سکی سرمایہ مسلماں ہو نہ سکا

نوخیز دُلہن اور عید کا دن کپڑوں سے نمایاں بدحالی
کملائے ہوئے سے غنچۂ تر مرجھائی ہوئی سی ہریالی
سوکھا ہوا چہرہ غربت سے اُتری ہوئی ہونٹوں کی لالی
مایوس نظر ٹوٹا ہوا دل اور ہاتھ بھی پیسے سے خالی
شوہر کی نظر حسرت سے بھری اُٹھتی ہے تو خود جھک جاتی ہے
احساسِ محبت کی دنیا اس منظر سے تھرّاتی ہے

خوں چوس رہا ہے پودوں کا اک پھول جو خنداں ہوتا ہے
پامال بنا کر سبزوں کو اک سرو خراماں ہوتا ہے
چربی مل کر انسانوں کی اک چہرہ درخشاں ہوتا ہے
یہ عید کے جلوے بنتے ہیں جب خونِ غریباں ہوتا ہے
مفلس کی جوانی عید کے دن جب صبح سے آہیں بھرتی ہے
دنیا یہ امیروں کی دنیا تب عید کی خوشیاں کرتی ہے

رات

شام کی چڑیوں کی خاموشی فضاؤں کا سکوت
گونجتی بجتی ترنم زا ہواؤں کا سکوت
دن کے آتشبار قاہر دیوتاؤں کا سکوت
ایک عنواں ہے ترے افسانۂ خاموش کا

ڈوبتے سورج کی کرنوں سے بھی شرماتی ہے تو
پردۂ رنگِ شفق میں جیسے چھپ جاتی ہے تو
شام کی بوتل میں مے ہو کر اُتر آتی ہے تو
تیری آمد زمزمہ ہے بزم نا و نوش کا

کھول کر آنکھیں ترے دامن میں تارے سو گئے
خاک کے ذرّے گلستاں کے شرارے سو گئے
چاندنی میں چاند کی کرنوں کے مارے سو گئے
مل گیا فطرت کو ثمرہ یوں گناہِ ہوش کا

اپنی کمزوری کو فطرت دیکھتی ہے خواب میں
آنکھ دھبّے دیکھتی ہے چادرِ مہتاب میں
کان سنتا ہے نوائے روح خاک و آب میں
تیرا عالم عالمِ دیگر ہے چشم و گوش کا

جاگتی ہیں سینۂ گیتی کی مہلک حسّیات
آتشِ محبوس کی صورت بھڑکتی ہے حیات
کروٹیں لیتی ہے روحِ انتقامِ کائنات
فیصلہ ہوتا ہے ہر بزمِ شقاوت کوش کا

جنبشِ عالم ہے نغمہ پردۂ آرام کا
نور اک چلتا مسافر ظلمتِ انجام کا
صبحِ رنگیں ترجمہ افسانہائے شام کا
تیرے فردا میں ہے اک پرتو جمالِ دوش کا

اَخبار نویس

اک تنگ سے ظلمت خانے میں بیٹھا ہے غریب اخبار لئے
کچھ فکرِ نظامِ خانہ لئے کچھ نکہتِ زلفِ یار لئے
اک تازہ مخالف مضموں پہ تنقیدوں کی بوچھار لئے
لکھتا ہے مگر ہر جملے پر جرأت کا قلم تھراتا ہے

اخبار لیا اور جا پہنچا بے جلتے ہیں جہاں عشرت کے دیئے
اس عیش کے مالک نے دیکھا پیشانیِ دولت ترش گئے
اتنا تو ضرور احسان کیا اخبار کے پیسے پھینک دیئے
اس تازہ شکستِ قسمت پر افلاس کا غم تھراتا ہے

اچھی جو رقم کچھ ہاتھ لگی پھر صدقِ زبانی لکھتا ہے
اوروں کی زباں بن جاتا ہے غیروں کی کہانی لکھتا ہے
ہنستا ہے خوشی کی سبکی سے اور غم کی گرانی لکھتا ہے
اس بیعِ ضمیر و ملت میں احساس کا دم تھراتا ہے

ایسے بھی ہیں جن کے خاموں سے گرتے ہیں صداقت کے تارے
چاہیں تو بہا دیں سطروں میں دلسوز فصاحت کے دھارے
حرفوں کو بنا دیں شعلہ صفت لفظوں کو بنا دیں انگارے
دو حرف سے ایسے خاموں کے شاہوں کا علم تھراتا ہے

پھر ہند کے چرخ کو کب پر شمسان کے گدھ منڈلاتے ہیں
مردے ہیں جو زندہ سڑکوں پر چلتے ہوئے پائے جاتے ہیں
دولت سے انھیں کفناتے ہیں غربت میں انھیں دفناتے ہیں
اموات کے اس نظارے میں عبرت کا قدم تھراتا ہے

کہکشاں

شاید اس رستے سے گزرا ہے خوشی کا کارواں
یا ہے اک شاعر کی تخئیلِ درخشاں کا نشاں
یا زبانِ حسرتِ گفتار ہے گوہر فشاں
یہ نظامِ آرزو ہے یا نظامِ کہکشاں

دیکھتا ہوں رات کے سینے میں تاباں آبلے
یا چمکتے ہیں زمانے کے دلوں کے حوصلے
یا نمایاں ہیں شعورِ زندگی کے ولولے
یہ ستاروں کا قفس ہے یا دلوں کا آشیاں

اُڑ رہا ہے چرخ کے وادی میں کوکب کا غبار
چاند کی کھیتی کا یا شاداب تر اک کشتِ زار
خوشۂ پرویں سے لہراتی ہوئی شامِ بہار
ماہ کا خرمن ہے جس کا حاصلِ انجم فشاں

آسماں پر جلوہ گر ہے فطرتِ رنگیں مزاج
مانگ ہے کیسی نکالی رات کی دیوی نے آج
چاند کی بندی ہے ماتھے پر کہ ہے چاندی کا تاج
حسن کی دنیا میں کیا فرقِ زمین و آسماں

یہ سڑک گزرے ہوؤں کی سیرگاہِ ناز ہے
ذرّہ ذرّہ اس فضا کا عالمِ پرواز ہے
اس زمیں کا گوشہ گوشہ اک بساطِ راز ہے
محورِ اجسامِ نوری ہے کہ روحوں کا مکاں

یا کسی شاطر نے پھیلائی ہے تاروں کی بساط
مہرہ مہرہ اس کا جنبش میں بہ نظم و احتیاط
اک طرف فرزینِ غم اور اک طرف شاہِ نشاط
ایک ہی بازی میں آخر ہو گئی عمرِ جہاں

اس اندھیرے میں بھی محوِ بیشِ تابانی ہے یہ
منتشر تاروں میں اک وحدت کی طغیانی ہے یہ
کیا کوئی مستقبلِ دنیائے انسانی ہے یہ
میرے مستقبل کا بھی اس میں ہے اک دھندلا نشاں

خون میں پانی

دھوکا ہے خیالِ آزادی پیغامِ زبانی جب تک ہے

شیروں کا سرِ مغرور یہاں روباہِ کہن سے نیچا ہے
زندوں کا لباسِ تن بھی یہاں مردوں کے کفن سے نیچا ہے
کہسارِ ہمالہ کا سر بھی توہینِ وطن سے نیچا ہے

اک داغ ہے یہ تاریخِ ستم دنیا کی کہانی جب تک ہے

آزاد شہیدوں سے میں نے پھر خون کے رشتے جوڑے ہیں
میدانِ سنان و خنجر میں کچھ دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں
افسردہ رگوں میں غیرت کی احساس کے شعلے توڑے ہیں

ٹھنڈا نہیں ہوگا میرا لہو گنگا کی روانی جب تک ہے

یہ خون جو میرے تن میں ہے طوفانِ جہاں بن جائیگا
قوت کے پہاڑوں کے حق میں شعلوں کا مکاں بن جائیگا
آنکھوں میں اتر آئیگا کبھی اور اشکِ رواں بن جائیگا
جم کر نہ رہے گا پلکوں پر اس خون میں پانی جب تک ہے

مینا جو قفس کی قید میں ہے اڑنے کے لئے پر تولے گی
جس عضو پہ نوکِ نشتر کو رکھ دیں گے رگِ جاں کھولے گی
محظوظ ہو یا بیزار کوئی ہر زندہ حقیقت بولے گی
خاموش نہ ہوگی میری زباں شوریدہ بیانی جب تک ہے

تہذیب کی صہبا کی بوتل اک دیدۂ نم رہ جائے گی
مذہب کی نوائے دلکش بھی اک آہِ الم رہ جائے گی
عالم کی سیاست ٹکرا کر اک جنگ بہم رہ جائے گی
دنیا میں نہ ہوگا امن و سکوں مفلس کی جوانی جب تک ہے

حسنِ ناتمام

بدلا نہیں نظام ابھی صبح و شام کا
خاکہ کھنچا نہیں ابھی تخلیقِ تام کا
ہے انتظار فیصلۂ خلقِ عام کا
قدرت نے جیسے روک لیا ہے قلم ابھی

کتنے خدائی ہاتھ ابھی آستیں میں ہیں
کتنی تجلیات نمودِ جبیں میں ہیں
کتنے فسانے خفتہ لبِ شکریں میں ہیں
کتنی جوانیاں ہیں اسیرِ ستم ابھی

ہے غلبۂ نشاط ابھی کیفِ ناتواں
پیہم تردّدات میں ہلکا نشہ گراں
مستی میں جزوِ ہوش کی شامل ہیں تلخیاں
صہبا نہیں تلافیِ بارِ الم ابھی

محلوں کی حد میں زہرہ شمائل اسیر ہیں
اور جھونپڑوں میں عشق کے گھائل اسیر ہیں
کافر شباب میں بھی یہاں دل اسیر ہیں
خود عشق جانفزا ہے زمانے کا غم ابھی

ناکامیوں کی زیست کوئی زندگی نہیں
جلوے کہاں کہ رُخ پہ یہاں تازگی نہیں
آئی بہار اور جوانی کھلی نہیں
انساں یہاں ہے باغ کے پھولوں سے کم ابھی

جذبات بجھ گئے ہیں دلِ بے قرار کے
کٹتے ہیں فکرِ تلخ میں لمحے بہار کے
روٹی ملی ہوئی ہے تخیل میں یار کے
بھوکی نگاہ دیکھ رہی ہے شکم ابھی

انفاسِ ناکام

بجز سعی و عمل دنیا میں اک تنکا نہیں ہلتا
ہوا کی چوٹ بے کھائے ہوئے غنچہ نہیں کھلتا
مثالِ برگ جنباں مانگنے سے کچھ نہیں ملتا
یہ جینا ہے تو پھر جینے کی زحمت کیا کرے کوئی

سفینۂ ظلم کا یوں خونِ انسانی میں کھیتے ہیں
رگِ مزدور سے شاید لہو تک چوس لیتے ہیں
ادارے سائنس چلنے کے لئے تنخواہ دیتے ہیں
تنِ لاغر شکستہ دل سے محنت کیا کرے کوئی

یہی دنیائے رنگ و بو جو مقصودِ بقا ٹھیری
یہی خود کامیِ عشرت طلب کی انتہا ٹھیری
نظر اسرارِ انسانی سے بھی نا آشنا ٹھیری
تو پھر حق کے لئے مرنے کی جرأت کیا کرے کوئی

اُدھر کانٹوں کی صورت ہم نگاہوں میں کھٹکتے ہیں
اِدھر سر پہ ہمارے قہر کے بادل لٹکتے ہیں
وہ ناداں ہیں جو خارِ راہ سے دامن جھٹکتے ہیں
قضا آئے تو پروائے جراحت کیا کرے کوئی

چراغِ فکر

اہرمن

یہ بزمِ عیش و عشرت تنگِ امکاناتِ ہستی ہے
ہمہ تذلیلِ صہبا ہے ہمہ توہینِ مستی ہے
زمیں پر آسمانِ ماہ سے لعنت برستی ہے
یہ عالم ہے کہ انساں ایک جرمِ خود پرستی ہے
ہمیں اب انتقامِ سعیِ نافرجام لینا ہے
ہمیں اس دور میں شیطان سے کچھ کام لینا ہے

اسی کا کام ہے ہر خودسری کو مضمحل کرنا
اسی کا کام ہے ہر مردہ دل کو زندہ دل کرنا
نفس میں قہر کی چنگاریوں کو منتقل کرنا
حرارت کو جوانوں کی رگوں میں مشتعل کرنا

بغاوت میں اِسی سے درسِ صبح و شام لینا ہے
ہمیں اس دَور میں شیطان سے کچھ کام لینا ہے

جو مستِ عیش خود کو مالکِ عالم سمجھتے ہیں
خیالاتِ وفا کو زندگی کا غم سمجھتے ہیں
جو اپنی ذات کو بالائے بیش و کم سمجھتے ہیں
جو اپنے کو بہشتِ ارض کا آدم سمجھتے ہیں

انھیں جنت سے باہر کر کے تب آرام لینا ہے
ہمیں اس دَور میں شیطان سے کچھ کام لینا ہے

یزداں سے

تری وحدت سرا میں راہ پیما ہے بیاں میرا
تخیل سے بھی آگے جا رہا ہے کارواں میرا

تری درگاہ سے شیطان نکلا سرکشی کر کے
مگر سجدوں سے اس کے سرگراں ہے آستاں میرا

تجھے پہچاننے والے ترے دیر و حرم والے
مگر ہر منکر و ملحد ہے گویا نغمہ خواں میرا

مری دنیا میں یکسر کفر ہے کوئی عبادت ہو
مگر تو مانگتا ہے سجدۂ بے خانماں میرا

تو پابندِ حیاتِ دائمی ہے ہر زمانے میں
مگر قادر ہے مٹنے پر بھی نقشِ جاوداں میرا

ترا دستِ قوی ہر فطرتِ جاوید کا خالق
شکستِ بندشِ تقدیر دستِ ناتواں میرا

ترا شیوہ ہے اقرارِ حقائق ہر مشیت میں
مگر ہے جراتِ انکار کا خالق گماں میرا

تو ذوقِ معصیت سے آج تک بیگانہ ہے شاید
مگر ہر اک نفس ہے بے گناہِ نو گراں میرا

تری دنیا مرے امکان کی وسعت نہیں رکھتی
مری ہستی بھی میری تو بھی میرا دو جہاں میرا

ابھی تک انتظارِ حشر ہے تیری خدائی میں
یہاں محشر بداماں ہر قدم پر خاکداں میرا

انسان

شکستہ سانس کو روحِ دو عالم کر رہا ہوں میں
رگِ مزدور میں خونِ انا الحق بھر رہا ہوں میں
مہ و خورشید باقی ہیں تو پھر فانی نہیں ہوں میں
میں انساں ہوں مگر توہینِ انسانی نہیں ہوں میں
میں انساں ہوں تو زندانِ خودی میں رہ نہیں سکتا
خدا ہو کر بھی اپنی بندگی میں رہ نہیں سکتا
نمودِ صد ملل میں ایک ہی انساں نمایاں ہے
یہ پیراہن ہزاروں چاک رکھ کر اک گریباں ہے

حباب بحر کو ٹکرا کے اک دن ٹوٹ جانا ہے
بڑھو آگے خودی کے آبلے کو پھوٹ جانا ہے

بقیدِ عشق ہستی بُت گری معلوم ہوتی ہے
محبت سے پرے بھی زندگی معلوم ہوتی ہے

نگاہِ عشق سے ہے پھر سوزِ دل کی بیش تابی پر
خدا قرآن نازل کر رہا ہے انقلابی پر

انقلابی

تعیش میرے آگے بھول جاتا ہے اداکاری
مری کشتِ بقا میں خونِ دل کرتا ہے گلکاری
مرا مسلک ہے تیغِ خودسری اور دستِ ہشیاری
میں فطرت سے لچکِ صہبا سے مستی چھین لیتا ہوں

میں پانی چھانتا ہوں اپنی پیشانی و ابرو سے
میں مٹی تولتا ہوں خونِ انساں کی ترازو سے
میں روزی بانٹتا ہوں اہتمامِ زورِ بازو سے
میں میکائیل سے روزی کی جھولی چھین لیتا ہوں

دکھا دیتا ہوں میں حق سے کبھی باطل کو ٹکرا کر
جہانِ خاک کے قدموں پہ گرتا ہے فلک آ کر
حکومت ارض کی شیطاں کو دیدیتا ہوں جھلا کر
پرِ جبریل سے پروازِ ہستی چھین لیتا ہوں

چراغِ کشتۂ غربت میں گل کرنے نہیں دیتا
بقا کے نقش میں رنگِ فنا بھرنے نہیں دیتا
میں جس کو زندہ کرتا ہوں اُسے مرنے نہیں دیتا
میں عزرائیل سے روحوں کی تھیلی چھین لیتا ہوں

عمل کو میں دکھاتا ہوں حدودِ فتنہ سامانی
نگہ کو بخشتا ہوں جلوہ زاروں کی فراوانی
تخیّل کو عطا کرتا ہوں اک ذوقِ پریشانی
نظر کا آسرا دل کی تشفی چھین لیتا ہوں

ادا گستاخ ہے میری نظر بے لاج ہے میری
میں خالی ہاتھ ہوں لیکن خدائی آج ہے میری
قدر ممنوں ہے میرا قضا محتاج ہے میری
میں قدرت سے بھی قدرت کی ہتھیلی چھین لیتا ہوں

مَعاشرِ جدید

یہ خوشامد کی عمارت کا ستونِ مرمریں
لعبتِ تہذیبِ حاضر پیکرِ دفتر نشیں
آستانِ زیست کا اک سجدۂ عبرت قریں
جس کی معراجِ ترقی حسرتِ عرضِ سلام

اس کا باطن روح فرسا مثلِ کافورِ کفن
اس کا ظاہر سبزۂ خاکِ مزابل کا چمن
شارعِ مغرب کی یہ رنگین دکانِ پیرہن
پیکرِ انساں میں ہے منت کشِ مشقِ خرام

شام کو بازارِ حسن و عشق میں ننگِ وجود
یا کسی بنگلے کی بزمِ ناز میں محوِ سجود
یا کسی ہوٹل کی خلوت گاہ میں مستِ سرود
آبِ انگوری حلال اور نانِ آزادی حرام

بے غرض ہوتی نہیں اس کی ادائے رسم و راہ
دوست کی آغوش یا دولت پہ ہے اس کی نگاہ
رات کے کاندھے پہ رکھتا ہے قبائے مہر و ماہ
گفتگو سُرخ و سفید و زندگی داغِ تمام

بزمِ اخلاصِ عزیزاں میں مگر آتش خصال
وہ روش جس سے جبینِ غمگساری پائمال
کچھ شکستِ شیشۂ دل کا نہیں اسکو خیال
اس کا ریشم ہے غریبوں کے لئے سنگِ خام

یوں شریکِ زندگی کے سامنے آئینہ ساز
ہر تبسّم ہر تکلم اک فریبِ دلنواز
دل کی دھڑکن میں نہاں ذوقِ ہوس کا اہتزاز
ہر ادا میں اک شکارِ حسن کا رکھتا ہے دام

اس کی تقریروں میں بے معنی عبارت کا خروش
آتشِ بے تاب و تابش دوزخِ فردوس پوش
حلقۂ ملّی میں یہ گندم نمائے جو فروش
تاش کے پتّے کی صورت ایک بازی کا غلام

طرزِ نو

زیست

لوگ کہتے ہیں کہ ہے زیست بھی اک عالمِ خواب
اور اک غنچۂ نورس کا تبسّم ہے شباب
تشنگی اور سراب

دستبازیِ خزاں شعبدۂ فصلِ بہار
اس گلستاں کا ہر اک پھول جراحت کی پکار
ہر نشہ اپنا اتار

میں یہ کہتا ہوں کہ دنیا کی کہانی پہ نہ جا
خوں رگوں میں ہے تو صہبا کی روانی پہ نہ جا
ذوقِ فانی پہ نہ جا

عشق کا چہرہ بدستور سفید اور سیاہ
سو گیا حشر مگر جاگ رہا ہے یہ گناہ

دل ہمہ چشم و نگاہ

زندگی خواب کے اوہام نہیں میرے لئے

دیکھتا ہوں میں پسِ پردۂ دیبا و حریر
حسن کی خندہ جبینی میں شقاوت کی لکیر
زرخرید ایک تبسم کی طرب خیز بہار

عشوۂ ہوش فگار

تنگ میرے لئے جلوؤں کی بھی آغوش نہیں
میں کسی ہونٹ کی صہبا سے بھی مدہوش نہیں
جادوئے نرگسِ بیمار سے خاموش نہیں

غم فراموش نہیں

قحط نبگاں مری چشم جہاں بیں میں ہے بند
اور سسکتی ہوئی لاشیں جو جواں میرہیں چند
ان کے بالیں پہ ہوں اک کاسۂ بے آب لیے
حسرت ناب لیے

غم کی کھڑکی سے میں جھانکوں یہ مجھے وقت کہاں
اور جلوؤں کی فضا دامنِ احساس کشاں
توڑ سکتا ہوں میں یہ رسمِ کہن کا در و بام
انقلابی مرا نام

آج تہذیب کی بنیاد ہے ساماں طلبی
مقصدِ زیست نہیں پھر بھی یہی تاں طلبی
کارواں دل کا دھڑکتا ہوا جاتا ہے کہیں
کوئی منزل ہے وہیں

بے محبت نہیں ممکن یہ جہنم کا عذاب
نغمۂ ذوق سے خاموش ہے جنت کا رباب
لذت خون جگر مستیِ ایجاد کا راز

خاک کی عمر دراز

زندگی خواب کے اوہام نہیں میرے لئے
لوگ کہتے ہیں کہ ہے زیست بھی اک عالم خواب
اور اک غنچۂ نورس کا تبسم ہے شباب

پنجۂ صیاد

زندگی پنجۂ صیاد میں ہے
اور پھڑکتی بھی نہیں
دل کے پردے میں کوئی روح دھڑکتی بھی نہیں

مِل سے اُٹھا ہے دھواں یا کہ ہے یہ دل کا دھواں
اس قدر شعلہ فشاں
اور مشینیں نوحہ کناں
دیکھنا عالمِ افلاس میں تسکینِ قلوب
روشنی اور غروب
شام کے وقت نکلتے ہیں مشینوں کے اسیر
جیسے زنداں کا خرام
دن کے انوارِ شرر بار پہ اس طرح بڑھا
دستِ خاموشیٔ شب
جیسے تنخواہ اُٹھاتے ہوئے اک خفتہ نصیب
نفسِ سرد بھرے
زندگی پنجۂ صیاد میں ہے

اور بھڑکتی بھی نہیں
خرقۂ زیست تو اب قابلِ پیوند نہیں
اور رفو بند نہیں
حسرتِ چاکِ گریباں ہے مجھے از سرِ نو
المدد دستِ جنوں
کروٹیں لیتی ہے اک قوم باندازِ خمار
نیم خوابی کی شکار
رہبرِ قوم کی مٹھی میں ہے پانی کا گلاس
اور جگاتا بھی نہیں
اس کی تقریر میں افیون کی پینک کا سرور
سو گئے اہلِ شعور
لہجہ بدلا تو ملے اس کو خموشی کے لیے

جنت وحور وقصور
زندگی پنجۂ صیاد میں ہے
اور پھڑکتی بھی نہیں

روٹی

زندگی یہ ہے کہ روٹی کو پکڑ دانت سے تو
اور خاطر میں رہے دولتِ آقا کا مزاج
ایک مٹھی یہ اناج
بیش قیمت ہے تری زلیست کے ادراک سے بھی
جذبۂ پاک سے بھی

بسترِ مرگ پہ آرامِ دلِ زار سہی
حسن بیمار سہی
جگمگاتی ہوئی کرنوں میں ہے دفتر کا پیام
یا لرزتا ہوا کام
تجھ سے کہتا ہے کہ اے بستۂ زنجیرِ امید
فاقۂ سرخ و سفید
تجھ کو دینا ہے ابھی گرسنہ ہمت کا ثبوت
لب پہ اک مہرِ سکوت
علم کی گردنِ نازک پہ ہے آہن کی طرح
دیوِ تنخواہ کا ہات
زیست کی سانس اکھڑ جائے تو کچھ بات نہیں
ایک مٹھی یہ اناج

بیش قیمت ہے ترے نزع کے انفاس سے بھی
پیکرِ روحِ بہیمی پہ ہے دولت کا غلاف
اس پہ گلکاریِ صاف
چشمِ ظاہر میں ہے نظارۂ خوش رنگ و لطیف
اندروں حشوِ کثیف

اک زر اندود نجاست پہ ہے طاعت کی جبیں
سجدہ بے سوز نہیں
آتشِ جوع سے پگھلا ہوا یہ حسنِ غیور
ایک طوفاں کا تنور
جس کا منہ بند ہے روٹی ہی کے سرپوش سے آج
ایک مٹھی یہ اناج
قابلِ سوخت ہے تیرے شکمِ آز کے ساتھ

امید کی کرن

کرن امید کی آخر
لئے جاتی ہے کیوں مجھ کو
اک ان دیکھی فضائے تار کی جانب
اجازت دے کہ تھوڑی دیر میں مایوس ہو جاؤں
اس آدم خوار غم کی زندگانی سے
گھٹا جاتا ہے دم میرا
یہ چلتا پھرتا گورستاں
یہ چلاتی ہوئی لاشیں
ہوا میں سانس یہ لیتے ہوئے مردے
بہا لے جائے کیوں ان کو نہ پھر گنگا کی طغیانی

یہ اک رسم جواں مرگی و مدفونی
جنازہ ایک ڈولی کا
کفن رنگین گھونگھٹ کا
یہ کھنائی ہوئی عورت
مری آنکھوں میں جیسے دخمۂ غمناک ہے دنیا
چتا کی آگ کیوں ان کو نہیں آکر جلا سکتی
یہ پیکرِ علم و دانش کے
یہ مالک روحِ عرفاں کے
خوشامدمیں ہیں جینے کی
نظامِ کہنہ کے ہیں ناصیہ فرسا
بہت خوش دُور سے پھینکی ہوئی تنخواہ کے اوپر
متاعِ دین و دانش بیچنے والے

لئیموں کی شقاوت کی
بچی اور باسی روٹی پر
غرورِ علم کے ماتے سبک عقلو
مری دنیا کے بیکارو
مرے دیہوں کے دہقانو
مرے شہروں کے مزدورو!
اٹھو اور زندگی کا اک جو اکھیلو
بجا دو اینٹ سے اینٹ اس نمائشگاہِ ذلت کی
کرن امید کی ظالم
لئے جاتی ہے کیوں مجھ کو
اک ان دیکھی فضائے تار کی جانب
اجازت دے کہ تھوڑی دیر میں مایوس ہو جاؤں!

چینِ جبیں

دیکھ یہ آئینۂ چینِ جبیں
اور اس پر یہ وراثت کا غبار
ایک پہچانی ہوئی شکلِ حسیں
اہرمن کا جیسے عکسِ ناگوار
مسخِ انسانی ہے یہ
رقصِ شیطانی ہے یہ
کس قدر دھندلی نظر آتی ہے تصویرِ حیات
رات ہے یا کائنات

دیکھ یہ آئینۂ چینِ جبیں
اور اس پر یہ پسینوں کی قطار
جیسے اک پگھلا ہوا کہسارِ غم
یا کوئی بہتا ہوا بارِ الم
جن سے آنسو بہہ کے آتے تھے وہ سوتے خشک ہیں
غم فراوانی پہ دیکھ
اشک پیشانی پہ دیکھ
دیکھ یہ آئینۂ چینِ جبیں
اور اس پر بے حجابی کی لکیر
ایک شکلِ دلپذیر
رقص کرتی ہے باندازِ بہار
کیسۂ منعم ہے یہ

ہے صدائیں اس کی چاندی کی کھنک کا ارتعاش
قلبِ انساں پاش پاش
سکۂ حاکم ہے یہ
جسم موزوں پر نقوش و تابدار
اندروں تاریک و تار
اس کی خلوت گاہِ تازہ جیبِ ہر سرمایہ دار
دیکھ یہ آئینہ رحبینِ جبیں
تابدار اور چُور چُور
ایک دوشیزہ مجسم نکہتِ گیسوئے حور
گا رہی ہے اور آوازوں میں لرزاں ہے حجاب
اشک چشمِ انقلاب
رقص بھو کی آتما کی جنبشِ پر اضطراب

نغمہ گویا پیاس سے نکلی ہوئی رنگیں زباں
دیکھ یہ آئینۂ چینِ جبیں
رنگ چہرے کا ہے فق
ایک مجرم پا بہ زنجیر اور عدالت کا مکاں
کچھ عزیز و اقربا
غمزدہ اور ناتواں
سیکڑوں جونکیں ہیں جن کے جسم سے لپٹی ہوئی
عدل کے تالاب کی یہ مچھلیاں
ہیں نہنگوں کا دہاں
ہے شکم میں ان کے دستِ دگردنِ عدلِ غریق
فکرِ طوفاں اے رفیق!

بہت اونچا اڑا لیکن اب اس اوجِ تخیل سے
کسی دنیائے رنگیں میں اُترتا جا رہا ہوں میں

دُنیائے رنگیں

ساون

کوئل کی سُریلی تانوں پر تھم تھم کے پپیہا گاتا ہے
حل ہو کے ہوا کی لہروں میں ساون کا مہینا آتا ہے
ٹھنڈی پُروا کالا بادل برسا تو برستا جاتا ہے
بوندوں کی مسلسل چوٹوں سے پتہ پتہ تھراتا ہے
ایسے میں کوئی یاد آتا ہے ایسے میں کوئی یاد آتا ہے
گھنگھور گھٹا بجلی پانی دل سینے میں لہراتا ہے
صحرا میں ہوا بل کھاتی ہے بادل کو صبا سنکاتی ہے
پانی سے زمیں نرماتی ہے سبزوں سے فضا لہراتی ہے

رم جھم رم جھم، تھم تھم تھم تھم بوندوں کی صدا جب آتی ہے
ہر بوند سے دل کے تاروں پر اک چوٹ سی پڑتی جاتی ہے

ایسے میں کوئی یاد آتا ہے، ایسے میں کوئی یاد آتا ہے
گھنگھور گھٹا بجلی پانی دل سینے میں لہراتا ہے

بدلی کے دنوں میخانوں میں صہبا کی روانی کیا کہنا
راتوں کی شراب و شاہد سے پلکوں کی گرانی کیا کہنا
ہر وقت سہانا کیا کہنا ہر رات سہانی کیا کہنا
برسات کے بھیگے لمحوں میں شاداب جوانی کیا کہنا

ایسے میں کوئی یاد آتا ہے ایسے میں کوئی یاد آتا ہے
گھنگھور گھٹا بجلی پانی دل سینے میں لہراتا ہے

رنگیں گلشن رنگیں صحرا رنگیں دنیا رنگیں باتیں
ناچیں کھیلیں دوڑیں بھاگیں راتوں جاگیں نیندوں ماتیں

کیا قہر ہیں ظالم برساتیں کیا قہر ہیں ظالم برساتیں
بھیگی دنیا بھیگی سانسیں بھیگے ارمان بھیگی راتیں

ایسے میں کوئی یاد آتا ہے ایسے میں کوئی یاد آتا ہے
گھنگھور گھٹا بجلی پانی دل سینے میں لہراتا ہے

ساون جو چڑھا پھر باغوں اور جھولوں کی باتیں ہوتی ہیں
گلشن کی رنگیں سیروں میں، کچھ رنگیں گھاتیں ہوتی ہیں
جب عہدِ جوانی کی ٹھنڈی برساتیں ہوتی ہیں
متوالی عمریں ہوتی ہیں متوالی راتیں ہوتی ہیں

ایسے میں کوئی یاد آتا ہے ایسے میں کوئی یاد آتا ہے
گھنگھور گھٹا بجلی پانی دل سینے میں لہراتا ہے

ناز آفریں

ایک لڑکی تھی ازبس ہی ناز آفریں
ماہ رو، ماہ رخ، ماہ وش مہ جبیں
اُس کے قد کے تناسب کا عالم نہ پوچھ
حشر کن حشر گل، حشر دل حشر دیں
اس کی زلفیں سنہری سنہری تمام
مشک بو، عود سا، صندلیں عنبریں
اس کے لبہائے رنگیں تھے جانِ حیات
احمریں احمریں شکریں شکریں

اُس کی آنکھوں کا جادو خدا کی پناہ
سرمگیں، شرمگیں، احمریں، نرگسیں

اُس کا جسمِ مصفّا بہشتِ نظر
صندلیں صندلیں مرمریں مرمریں

ایک ساری تھی اُس کے تنِ صاف پر
سبزہ گوں سبزہ ساں ساونیں ساونیں[لہ]

حسنِ ظاہر بھی تھا حسنِ باطن بھی تھا
تن حسیں، جاں حسیں، دل حسیں، سب حسیں

اس کا طرزِ تکلم سراپا کشش
دلستاں، دلربا، دل فزا، دلنشیں

جب وہ ملنے کو آتی تو آتی تھی وہ
سہمی سہمی سی اور شرمگیں شرمگیں

لہ ایک عمدہ ساری

میں محبت کی نظروں کا مارا ہوا
دیکھتے ہی جگر تھام لیتا ہوں
زندگانی کے احساس میں جھوم کر
میں نے اُس سے کہا اے حیات آفریں
ایسی عمریں کہاں ایسی راتیں کہاں
ہے یہی زندگی میں جواں تو حسیں
پوچھتی جب وہ مجھ سے مرا رازِ دل
میں یہ کہتا نہیں، کچھ نہیں کچھ نہیں
وقتِ رخصت وہ اُس کا نہیں بھولتا
ہر نظر اولیں، ہر نظر آخریں

گرمیوں کی شام

یہ گرمیوں کی شام یہ جذبات کا وفور
انفاسِ تیز خونِ رواں روح پُر سرور
نکھرے ہوئے شباب سے تنویر کا ظہور
ٹھنڈی ہوا خموش فضا اور قمر کا نور
یہ گرمیوں کی شام ہے یا حسنِ بے نقاب

موسم کے اضطراب سے روحِ بہار مست
خوشبو کے انتشار سے گل کی قطار مست
حدت کے امتزاج سے لیل و نہار مست
گرمی کی کیفیات سے اندازِ یار مست
یہ گرمیوں کی شام ہے یا نشۂ شراب

دن بھر کی تیز دھوپ میں جلتا ہوا شباب
فصلِ جنوں کی چھاؤں میں پلتا ہوا شباب
موسم کی لذتوں سے بہلتا ہوا شباب
گرمی کی شورشوں سے مچلتا ہوا شباب
یہ گرمیوں کی شام ہے یا شامِ اضطراب

کرنوں کے بعد چھاؤں سے پیدا ہے اک جنوں
منظر ملیح وقت سہانا نظر فسوں
گرمی بجا رہی ہے عناصر میں ارغنوں
نغموں کے ساتھ دوڑ رہا ہے رگوں میں خوں
یہ گرمیوں کی شام ہے یا روح کا رباب

دل کی توجہات پہ قابو نہیں رہا
رنگیں تخیلات پہ قابو نہیں رہا

خود اپنی کائنات پہ قابو نہیں رہا
دن اور اپنی رات پہ قابو نہیں رہا

یہ گرمیوں کی شام ہے یا شامِ انقلاب

لمحۂ کیف

گل و نغمہ و بادۂ ارغوانی — بس اک لمحۂ کیف ہے زندگانی
مری عمر فانی ہو یا جاودانی — نہ آئے گی دوبارہ ظالم جوانی
نہ یہ صبح ہوگی نہ یہ شام ہوگی — نہ یہ رات ہوگی سہانی سہانی
نہ یہ عمر ہوگی نہ یہ حسن ہوگا — نہ یہ دل رہے گا نہ یہ دلستانی
نکل جائیگا جب شبابوں کا عالم — پکارے گی دنیا جوانی جوانی
یہی بے ثباتی ہے رازِ محبت — یہی اصل نظارۂ حسن فانی

اگر تو نے پایا تو میں نے بھی پایا　　تری کامرانی مری کامرانی
محبت کئے جا محبت کئے جا　　یہی زندگی ہے یہی زندگانی
محبت نہیں رحم کرتی کسی پر　　محبت نہیں دیتی پیاسے کو پانی

کوئی سن رہا ہے تو میں کہہ رہا ہوں
مجھے کیا ہے میں ختم کر دوں کہانی

بسنت

یہ رُت یہ بسنتی رُت ظالم سردی گرمی سے گلے ملتی
ہر سو سودائے نظر ارزاں ہر سو زنجیر جنوں ہلتی
موسم کی بہار افزائی سے گلزاروں میں کلیاں کھلتی
پھاگن کے گلابی چھینٹوں سے ہر سو سبزے اُگ آئے ہیں
سرسوں پھولی کلسے پھوٹے چھلکے ہوئے بادل چھائے ہیں

کھیتوں میں ہوا کے چلنے سے لہراتی ہے جو کی بالی
ہلکے ہلکے بادل ہیں چھپی چلتی ہوئی سورج کی تھالی
پھاگن کی ہوائے دلکش سے شاداب ہے ہرا من کی ڈالی
آخر ہیں مٹر کے پھول کہیں آموں میں کہیں بور آئے ہیں
سرسوں پھولی کلسے پھوٹے چھٹکے ہوئے بادل چھائے ہیں

جلوؤں کا وہ جھرمٹ ہوتا ہے پھاگن کے بسنتی میلوں میں
جیسے کبھی جگمگھٹ ہوتا ہے آئینہ رخوں کا ریلوں میں
دل ہار گئے ہیں اہلِ نظر ان ذوقِ نظر کے کھیلوں میں
ہر گام پہ ایسے میلوں میں اک پارۂ دل چھوڑ آئے ہیں
سرسوں پھولی کلسے پھولے چھٹکے ہوئے بادل چھائے ہیں

شفاف جبینوں نے جیسے افلاک سے بادل توڑے ہیں
اُس شوخ نے آنچل ڈالا ہے اس شوخ نے بازو موڑے ہیں
چہروں پہ بسنتی عالم ہے جسموں پہ بسنتی جوڑے ہیں

اس رنگ نے جانے کتنوں کے احساس پہ نشتر ڈھائے ہیں
سرسوں پھولی کلسے پھوٹے چھٹکے ہوئے بادل چھائے ہیں

اک یاد حسیں کے ہاتھوں سے پھر ضبط کے ہالے ٹوٹے ہیں
رستی ہے شراب اشکِ الم پھر غم کے پیالے ٹوٹے ہیں
پھر تازہ ہوا ہے زخم جگر پھر قلب کے چھالے ٹوٹے ہیں

اس رُت نے گذشتہ افسانے اس رنگ سے کچھ دہرائے ہیں
سرسوں پھولی کلسے پھوٹے چھٹکے ہوئے بادل چھائے ہیں

اس رت میں سڑک پر کچھ دہقاں بیٹھے ہوئے ہیں ماندہ ہارے
دولت کی مشینوں کے لوٹے قسمت کے شکنجوں کے مارے
فاقوں کی مصیبت سے جن کو آتے ہیں نظر دن کو تارے

اور اپنے جگر کے ٹکڑوں کو روتا ہوا گھر چھوڑ آئے ہیں
سرسوں پھولی کلسے پھوٹے چھٹکے ہوئے بادل چھائے ہیں

رس

ہوا میں رس فضا میں رس بہار و بوستاں میں رس
جوانیوں نے بھر دیا ہے جیسے کل جہاں میں رس
نئی نئی جوانیوں کی دل کشی نہ پوچھیے
نظر میں رس لبوں میں رس سخن میں رس بیاں میں رس
ادا کے ساتھ آ گئی ہے گفتگو میں دل کشی
کوئی بیانِ حسن ہو نہیں میں لطف ہاں میں رس
ٹپک رہی ہے بے خودی شبابِ نیم خواب سے
غنودگی نے بھر دیا جمالِ جانستاں میں رس

وہی ادائے دلبری وہی ادائے شاعری
وہی تری نگہ میں مے وہی مرے بیاں میں رس
نشے کے امتزاج سے بدل گئے ہیں دن نشورؔ
شراب سے کچھ آگیا ہے موسمِ خزاں میں رس

نمایش گاہ کے جلوے

اٹھتی جوانی اٹھتی نگاہیں قاتل وہ بازو قاتل وہ باہیں
اُف ری جوانی اُف ری نگاہیں وہ مر ہی جائے یہ جس کو چاہیں
غنچوں سے پُر ہیں پھولوں سے پُر ہیں یہ جلوہ گاہیں یہ سیر گاہیں
جلوؤں میں گھر کر شاعر ہے حیراں بدلی ہیں سمتیں بھولی ہیں راہیں

تھرّا گئے ہیں سینوں میں ارماں　　ہل ہل گئی ہیں اکثر نگاہیں
چنچل جوانی، بسمل محبت　　چلتی ہیں راہیں بھرتی ہیں آہیں
رندوں کو دیکھا مستوں کو دیکھا　　بانکی قبائیں ٹیڑھی کلاہیں
ہمجولیوں کا جھرمٹ قیامت　　نظروں میں نظریں باہو ں میں باہیں
دوشیزگاں ہیں محشر سراپا　　چلئے دکھائیں گر آپ چاہیں
حشر مجسم قتلِ دو عالم　　اٹھتی جوانی، نیچی نگاہیں

یہ شاعری ہے یا زندگی ہے
یا شعر بن کر نکلی ہیں آہیں

گنگا کا کنارا

ساون کی گھٹاؤں میں وہ گنگا کا کنارا
چڑھتی ہوئی لہریں وہ اُمنڈتی ہوئی دھارا
وہ شام کا منظر وہ دھندلکے کا نظارا
دل تھام کے میں بیٹھ گیا شوق کا مارا

الفاس ادھر تیز ادھر تیز تھا دریا
جیسے مرے سینے میں بھی لبریز تھا دریا

سرسبز کناروں سے گھرا الجھا کا پانی
جیسے کہ ہری شال میں ہو کوئی جوانی

بادل میں سموئی ہوئی وہ شام سہانی
گھٹتی ہوئی بڑھتی ہوئی موجوں کی روانی

بہتا تھا مگر جیسے کہ مدہوش تھا دریا
جیسے کسی معشوق کی آغوش تھا دریا

سرسبز درختوں کا وہ پانی میں لٹکنا
ساحل کی سیاہی میں وہ موجوں کا چمکنا
بادل کی فضاؤں میں ہواؤں کا بہکنا
بھولی ہوئی یادوں کا مرے دل میں کھٹکنا

جذبات کی دنیا میں بھی طوفان تھا دریا
جیسے کوئی بہتا ہوا رومان تھا دریا

نکلا جو قمر پھر تو شراروں کا تھا عالم
بہتی ہوئی سیماب کی دھاروں کا تھا عالم

امواج میں چاندی کے اُبھاروں کا تھا عالم
دریا تھا کہ سیال ستاروں کا تھا عالم

مہتاب کے پرتو سے جو بیتاب تھا دریا
جیسے کہ جوانی کا کوئی خواب تھا دریا

مہتاب کی کرنوں میں وہ جلوؤں کے نظارے
جیسے کہ اُتر آئے ہوں دریا پہ ستارے
لٹکائے ہوئے زلف تو آنچل کو اتارے
جاتے ہوئے دل چھوڑ گئے عشق کے مارے

پانی کے کناروں پہ وہ شاداب جوانی
رُک رُک گئی تھم تھم گئی دریا کی روانی

جلوۂ سحر

تمام اوراقِ شبستاں سحر کی کرنوں سے جگمگائے
طلوع ہوتی ہے صبح جیسے کلی تمنا کی مسکرائے
کہیں درختوں میں غول چڑیوں کا بیٹھ کر چہچہا رہا ہے
کہیں سے طوطوں کا جھنڈ اٹھا فضائے گلشن میں غل مچائے
سڑک جو آتی ہے چھاؤنی سے چہل پہل اس پہ خوب ہی ہے
نکل کے گنجان بستیوں سے برائے تفریح سب ہیں آئے
اسی پہ جاتا ہے ایک موٹر کبھی ڈاک خانے کا ڈاک لینے
اسی پہ جاتے ہیں کچھ دہاتی لدی ہوئی گاڑیاں ہنکائے

ٹہلنے جاتی ہیں لڑکیاں کچھ حسین پھولوں کی کیاریوں میں
نگاہ جادو شباب جادو جو آنکھ ڈالے وہ لٹ ہی جائے

اِدھر سے گنگا کو جا رہے ہیں کچھ آدمی چھاگلیں سنبھالے
اُدھر سے گنگا سے آ رہی ہیں کچھ عورتیں نور میں نہائے

اِدھر سے کالج کی ایک لڑکی بھی اپنے کالج کو جا رہی ہے
کتاب والے قدم بڑھائے شباب تھامے نظر جھکائے

اِدھر سے اک نوجوان لیڈی نئے خیالوں کی آ رہی ہے
نگاہ رقصاں شباب عریاں جو اس کو دیکھے وہ مسکرائے

اِدھر سے شاعر نشورؔ حیراں بھی اپنی سیر دمیں جا رہا ہے
قدم تخیل میں ڈگمگائے نئے شبابوں سے چوٹ کھائے

سرشاری

ساون کی ہوا مست جوانی کی ادا مست
گھنگھور گھٹا مست ، ردا مست حنا مست
مستانہ خرامی کا بھی انداز ہے کیا مست
رفتار ہے سرشار تو ہے لغزشِ پا مست
ہر ذرہ جوانی کی شرابوں سے ہوا مست
خود مست بھویں مست نگہ مست ادا مست
آہستہ خرامی سے چمن زار بقا مست
گل مست شجر مست ہوا مست فضا مست

جھرمٹ

یہ سرو قد وہ ماہ رو یہ شادماں وہ گل چکاں
نئی نئی جوانیوں کو دیکھئے تو الاماں
کوئی ردائے سبز میں کوئی لباسِ زرد میں
ہر ایک غارتِ نظر، ہر ایک غارتِ جہاں
اِدھر چلی اُدھر پھری، اِدھر مڑی اُدھر گئی
لچک رہی ہو جیسے کوئی نرم شاخِ گلفشاں
گزر رہے ہیں تشنہ کام کنکھیوں سے دیکھتے
لئے کھڑی ہے زندگی پیالہ ہائے مے فشاں

نظر کہیں ٹھہر گئی تو تھرتھرا کے رہ گئی
کہ جیسے سر سے پاؤں تک لپک رہی ہوں بجلیاں
دراز چوٹیوں کی لہر ناگنوں کا کانپنا
برہنہ بازوں کی مار ایک تیرِ بے کماں
صبا بھی نرم رو سی ہے کلی بھی ادھ کھلی سی ہے
نئی نئی بہار کا نیا نیا ہے گلستاں
جوانیوں کے کھیل ہیں نگاہ ہے جہاں ہے
تمام کرنے آئے ہیں ہم اپنی اپنی باریاں
نئی نئی نگاہ ہے ذرا سنبھل کے دیکھنا
یہی حدِ شباب ہے یہیں لٹا تھا کارواں
تمام تر متاعِ زیست دل کے تھامنے میں ہے
کہاں ہے دستِ آرزو کہاں ہے ہمتِ جواں

بھرپور جوانی

یہ حسن یہ تصویر یہ تنویر مجسم
اُمڈی ہوئی بھرپور جوانی کا یہ عالم
نشتر لئے خنجر لئے جادوئے مجسم
آنکھیں ہیں ذرا شوخ تو ابرو ہے ذرا خم
یہ اُس سے زیادہ ہے تو وہ اس سے زیادہ
رُخ کم نہ بھویں کم نہ نظر کم نہ ادا کم
رفتارِ قیامت لئے آغازِ جوانی
جیسے کہ وہیں ٹھہر گئی جنبشِ عالم

یہ اشعار اکھنڈ فتح پرکاش پر کہے گئے تھے۔

کیا عرض کروں ایک اچانک کی ملاقات
گھبرائے ہوئے حسن کے انداز وہ برہم
اب دیکھئے کیا ہو کہ ہے کانٹوں سے سروکار
اب تک تو بہاروں ہی بہاروں میں رہے ہم

بدگمانی

تجھ کو شکایتیں ہیں کہ بدلا ہوا ہوں میں
راہِ وفا سے دور ہوا جا رہا ہوں میں
لیکن جو اپنے آپ کو پھر دیکھتا ہوں میں
اب بھی ہلاکِ منزلِ عہدِ وفا ہوں میں
اب تک وہی خیال وہی دل ہے موئتنا

کو سلکِ شعریت میں پرو دیا ہوا ہوں میں
دنیا ہوئی خموش تو گویا ہوا ہوں میں
دامانِ فکرِ شعر میں سویا ہوا ہوں میں
یعنی جمالیات میں کھویا ہوا ہوں میں
لیکن وہی حیات کی منزل ہے موئسنا

جاری ہے اور رہے گا یہ عالم کا شور و شر
ہے زندگی کا راز یہی جنگِ ہمہ گر
پھر بھی غمِ جہاں سے محبت ہے دُور تر
روحوں کی زندگی ہے غم و اشک و آہ پر
دل ساری کائنات کا حاصل ہے موئسنا

غارت گر

یاد آیا اک دلکش منظر — یعنی اک دوشیزہ پیکر
عمر ہی اس کی چودہ سولہ — قاتل ظالم فتنۂ محشر
گوری گوری باہیں اس کی — رنگیں شاخِ گل سے بڑھ کر
لانبے لانبے بازو اس کے — جیسے شیشہ آئے ڈھل کر
موزوں موزوں قامت اسکی — رعنا دلکش دلجو دلبر
رس میں ڈوبی آنکھیں اسکی — جادو بابل نشہ ساغر
پلکیں اس کی گھومی گھومی — دشنہ پیکاں خنجر نشتر
کالے کالے گیسو اس کے — کوئل بادل سنبل عنبر

سرمہ ابرو مانگ اور ٹیکی شوشہ گوشہ نقطہ مسطر
ہلکی پتلی نازک ساری جس سے ضو آتی چھن چھن کر
دل سینے کے اندر مچلا سب کچھ میں بھولا لکھ پڑھ کر
رہتی تھی نزدیک ہی مجھ سے ملتی آتی جاتی اکثر
اک دن اس کو تنہا دیکھا آہیں لب تک آئیں اُٹھ کر
دھیمے لفظوں میں میں بولا اے غارتگر اے غارتگر

ٹھہری سمجھی اور شرمائی
دیکھا مڑ کر بھاگی ہنس کر

حسنِ ہندوستاں

حشر ہے حشر ہے حسنِ ہندوستاں — سانولی سانولی صورتیں الاماں
جب کہ ہوتی اکٹھی ہیں ہمجولیاں — چلتی ہیں پھبتی ہیں خندہ زن کج زباں
کوئی آہستہ رو کوئی ہر سو دواں — کوئی دامن کشاں کوئی دامن فشاں
تھا لڑکپن تو معصوم تھیں شوخیاں — اب جوانی جو آئی تو یارب اماں
ابروئیں بھی سیہ نرگسیں بھی سیہ — زلفِ شبگوں گھٹاؤں کا دلکش سماں
حسن سمٹا ہوا ناز سنبھلا ہوا — ہے جوانی لباسِ حیا میں یہاں
صبح نکلی تو شرمِ نگاہ و سخن — شام آئی تو خاموش تیاریاں
رات آئی تو جادو لئے ہر نظر — چاند نکلا تو محشر لئے ہر سماں
گرمی آئی تو سیرِ گلستان و گل — ساون آیا تو جھولوں کی بدمستیاں
کوئی گزرا تو آنکھوں کا گوشہ ادھر — کوئی آیا تو نظریں یہاں دل وہاں

ہیں بلا کی حسیں اور بلا کی ذہیں　　نکتہ جو نکتہ گو نکتہ رس نکتہ داں

کالج کا ایک حسین داخلہ

کالج میں آج پڑھنے آئی ہے اک ستمگر
یہ داخلہ ہے ظالم یا انتظامِ محشر
زلفِ سیاہ شب کے رومان کی کہانی
آنکھیں سنا رہی ہیں افسانۂ جوانی
ابرو کھنچے کھنچے سے زلفیں گھنی گھنی سی
ساون کی بدلیوں میں پھیلی ہے چاندنی سی
وہ گول گول بازو اور وہ بھری جوانی
سانچے میں ڈھل گئی ہے صہبائے زندگانی

رفتار کی لچک میں اندازِ خود سری ہے
قد ہے کہ دلکشی خود انگڑائی لے رہی ہے
چالاک انکھڑیوں میں تیور کھرے کھرے سے
آنکھوں میں مے پڑی سی ہونٹوں میں رس بھرے سے
نازک کلائیوں میں وہ چوڑیوں کی کھن کھن
صندل کی ٹہنیوں میں لپٹی ہوئی ہے ناگن
اک حشر کا تناسب اعضا کے بیش و کم میں
کستی ہوئی جوانی ساری کے پیچ و خم میں
جب بے خیالیوں میں آنچل ڈھلک رہا ہے
رنگیں جوانیوں کا ساغر چھلک رہا ہے
روشن جبیں پہ جیسے تارا چڑھا ہوا ہے
چاندی دمک رہی ہے پارا چڑھا ہوا ہے

آنکھیں بغیر جاگے جب دیکھئے گلابی
دوشیزگی ہے یا اک دنیائے نیم خوابی
شرماتی اور لجاتی کتراتی اور بہکتی
درجے میں آئی ہے وہ پہلے پہل جھجکتی
رنگیں کتاب دابے ظالم شباب تھامے
دوشیزہ انگلیوں سے دل کا رباب تھامے
عالم کی بجلیاں ہیں اٹھتی ہوئی نظر میں
آواز بھی ہے ظالم ڈوبی ہوئی اثر میں
احساسِ رنگ و بو میں اس طرح کھوئی کھوئی
جیسے کہ فرشِ گل پر دوشیزگی ہو سوئی
ہونٹوں سے رس رہی ہے بے تابیِ تکلم
آنکھوں میں ہلکی ہلکی کیفیتِ تبسم

رعنائیاں بہکتی دوشیزگی مہکتی
معصوم سادگی سے سرشاریاں ٹپکتی
نظریں جھکی جھکی سی اٹھتی بھی ہیں تو کم کم
جیسے لجا رہی ہو پھلواریوں میں شبنم
بیداریوں میں بھی اک دنیائے خواب ہے وہ
لڑکوں کے واسطے اک رنگیں کتاب ہے وہ
اک انقلاب سا ہے لڑکوں کی زندگی میں
کھوئی ہوئی ہے وہ بھی احساسِ دلکشی میں
کیا جانے بات کیا ہے کیا جانے کام کیا ہے
ہر ایک کو خلش ہے ظالم کا نام کیا ہے

پیامِ بہار

جہانِ رنگ و بو کو یہ بسنت کا پیام ہے
کہ اس بہار کی رگوں میں اک نیا نظام ہے
نیا یہ دن ہے سال کا نئی نظر سے کام ہے
گزر گئے جو کہہ رہے تھے زیست غم کا نام ہے

چڑھا لو جامِ سرخوشی جو پی کے تم سنبھل سکو
بدل دو رنگِ میکدہ جو میکشو بدل سکو

یہ چھٹکی چھٹکی بدلیاں یہ ذوق انتشار کے
یہ سرسوں کے گلِ حسیں یہ حسن کشت زار کے

زمیں پہ زرد رنگ میں مظاہرے بہار کے
یہ قافلے ہر ایک سمت حسن کی قطار کے
گزر رہے ہیں رنگ کی قیامتیں لئے ہوئے
جنوں ہے اپنے فصل کی حکایتیں لئے ہوئے

عجیب ذوق و شوق ہے عجیب سوز ساز ہے
بسنت دل نواز ہے بہار دلگداز ہے
سمجھ سکا نہ آسماں کہ کیا زمیں کا راز ہے
تمام قوس و کہکشاں یہ عالمِ مجاز ہے
منا رہے ہیں سب بسنت اپنے اپنے ڈھنگ سے
کسی نے رُت ہی لوٹ لی ہے اوڑھنی کے رنگ سے

لہک سے زرد پھول کی بہار ہر مکاں ہوا
تمام شہر رنگِ گل سے کشتِ زعفراں ہوا

لہو پریم کا رگوں میں تیز تر رواں ہوا
کوئی لباسِ موسمی پہن کے گلچکاں ہوا
کسی نے کر دیا وداع ہوش کو اک آہ سے
کسی نے جیسے چھو لیا بسنت کو نگاہ سے

یہاں سے دور تر جہاں کہ جھنڈ ہیں کچھ آم کے
ہتیلی پر جا رہے ہیں سرسوں رنگ شام کے
جہاں بسنت کی خبر نہیں ہے دھن میں کام کے
بسنت ہے مگر خوشی کے زمزمے ہیں نام کے

وہیں چلو کہ زندگی کی کائنات دیکھ لیں
حیات دیکھ ہی چکے غمِ حیات دیکھ لیں

میری آنکھوں میں ہے آنسو تیرے دامن میں بہار
گل بنا سکتا ہے تو شبنم بنا سکتا ہوں میں

شبنم و گل

گزرے ہوئے دلکش لمحوں کی بھولی ہوئی یاد ایسی آئی
جیسے کوئی یتیم پردیسی سوتے میں اچانک آ جائے

آنسو

جب سے کہ محبت ہوئی پیارے ہیں یہ آنسو
جیسے کہ مری آنکھ کے تارے ہیں یہ آنسو

کہتے ہو کہ للّٰلہ اب آنسو نہ گراؤ
ایسے میں کہ جینے کے سہارے ہیں یہ آنسو

ہاں ہاں انھیں دامانِ محبت میں جگہ دو
آنکھیں ہیں مری اور تمھارے ہیں یہ آنسو

ہر خونِ جگر کے لئے تیار ہوں اب بھی
ہارا ہوں نہ میں اور نہ ہارے ہیں یہ آنسو

سیماب ہیں جبتک کہ ہیں یہ قلب و جگر میں
آنکھوں میں جب آئے تو ستارے ہیں یہ آنسو

بے چین امنگوں نے نہ سمجھا ہی نہ دیکھا
بیتاب جوانی کے نظارے ہیں یہ آنسو
غم وہ ہے جو ہر چیز کو پگھلا کے بہادے
پانی نہیں سیال شرارے ہیں یہ آنسو
معصوم نگاہوں کو بھگوتے ہیں یہ اکثر
پوشیدہ محبت کے اشارے ہیں یہ آنسو
غمخوار ہیں میرے لئے شبہائے الم میں
آخر تو غمِ دوست کے مارے ہیں یہ آنسو

جیسے کوئی جائے چھوڑ کے گھر

اور دیپک جلتا رہ جائے
غم وہ ہے جو دو ارمانوں کی تسکین میں حائل ہو جائے
یعنی کہ ہوں خشک لبِ ساحل اور بیچ میں دریا لہرائے

اِس بزمِ محبت میں آکر بیٹھے تھے کہ محفل ختم ہوئی
دل کے نہ فسانے سن پائے غم کی نہ کہانی کہہ پائے

خورشیدِ قیامت کے آگے کرنوں کا مقابل کیا ہوگا
جو ملک بسے شب خانوں میں جو قوم چلے سایے سایے

یوں عہدِ جوانی بیت گیا اور یادِ جوانی دل میں رہی
جیسے کوئی جائے چھوڑ کے گھر اور دیپک جلتا رہ جائے

آغوشِ مسرت میں جینا مشروط ہے غم میں مرنے پر
جو سو نہ سکے وہ کیا جاگے جو کھو نہ سکے وہ کیا پائے

تخئیل کی فرضی دنیا میں کیا مشقِ سخن کی پروازیں
شاعر تو وہی شاعر ہے نشورؔ اک شعر کہے اور بھرائے

دامانِ خزاں بھی چھو نہ سکا
اندازِ بہاراں کیا جانوں

پروردۂ دردِ حرماں ہوں میں لذتِ درماں کیا جانوں
میں چاکِ گریباں ہوں اپنا میں حسن کا داماں کیا جانوں

دیکھا ہے اُنھیں دیکھا ہے مگر حائل تھے حجابِ حسن و نظر
میں حالِ پریشاں کہہ نہ سکا وہ زلفِ پریشاں کیا جانوں

میں کارِ زمیں بھی کر نہ سکا پروازِ فلک کے کیا معنی
کافر بھی مکمل ہو نہ سکا اسرارِ مسلماں کیا جانوں

اس حسن کے سنگِ دولت پر سجدوں کا مرے انجام نہ پوچھ
میں گوشۂ خاطر پا نہ سکا وہ گوشۂ داماں کیا جانوں

تعلیمِ درخشاں کے جلوے تہذیبِ زر افشاں کے دھوکے
میں گردشِ انساں کا مارا یہ گردشِ دوراں کیا جانوں

میں خون کے قطروں کو ہمدم گنتا نہیں غدار دل کی طرح
میں تشنۂ آبِ خنجر ہوں میں پاسِ رگِ جاں کیا جانوں

ہر گام پہ جلوے حسن کے تھے لیکن نہ ہر اک پر لوٹ ہوا
میں عظمتِ دل کا رکھوالا بازیچۂ ارماں کیا جانوں

گلزار میں جس دم میں پہنچا سوکھے ہوئے غنچے بھی نہ ملے
دامانِ خزاں بھی چھو نہ سکا اندازِ بہاراں کیا جانوں

اغیار کے آگے جھکتے ہیں کس طرح مجھے معلوم نہیں
میں شاعرِ طبعِ آزادی آدابِ غلاماں کیا جانوں

وہ رات تھی میری رات بھی جو آغوش میں بھی کاٹے نہ کٹی
میں صبحِ غریباں کر نہ سکا یہ شامِ غریباں کیا جانوں

ہستی نے نشورؔ آتش ہو کر کاشانۂ الفت پھونک دیا
میں خاکِ گریباں کا مالک یہ چاکِ گریباں کیا جانوں

جیسے کہ دُلہن پہلی شب کی
آہٹ جو ملے تھرا جائے

اس دل کی مصیبت کون سنے جو غم کے مقابل آجائے
کس نے یہ کہا تھا تنکے سے وہ بجلی سے ٹکرا جائے
دنیا کی بہاروں سے آنکھیں یوں پھیر لیں جانے والوں نے
جیسے کوئی لمبے قصّے کو پڑھتے پڑھتے اکتا جائے
آغازِ محبت ہے اور دل یوں ہاتھ سے نکلا جاتا ہے
جیسے کسی الھڑ کا آنچل سر کا جائے ڈھلکا جائے
گزرے ہوئے دلکش لمحوں کی بھولی ہوئی یاد ایسی آئی
جیسے کوئی یتیم پردیسی سوتے میں اچانک آجائے
جب پہلے پہل محسوس ہوا ہے حسن تو دل ایسا کانپا
جیسے کہ دلہن پہلی شب کی آہٹ جو ملے تھرا جائے

کنگھے سے گھنیری زلفوں میں یوں لہریں اٹھتی جاتی ہیں
جیسے کہ دھندلکا ساون کا بڑھتا جائے بڑھتا جائے

ہستی کا نظارہ کیا کہئے مرتا ہے کوئی جیتا ہے کوئی
جیسے کہ دِوالی ہو کہ دیا جلتا جائے بجھتا جائے

اک آس جو دل کی ٹوٹ گئی پھر دل کی خوشی باقی نہ رہی
جیسے کہ اندھیرے گھر کا دیا گل ہو تو اندھیرا چھا جائے

دل ہے کہ نشورؔ اک باجا ہے سینے کے اندر تاروں کا
جب چوٹ پڑے جھنکار اُٹھے جب ٹھیس لگے تھرا جائے

تمام داغ و درِدِ دل سے کھیلتا چلا گیا
اِدھر اُدھر سے حسن کو سمیٹتا چلا گیا
نئی نئی جوانیوں کو دیکھتا چلا گیا

جو منزلِ شباب کی طرف بڑھا تو کیا کہوں
قدم قدم پہ خاکِ دل بکھیرتا چلا گیا

نہ رنج و غم میں میں مٹا نہ رنگ و بو میں میں پھنسا
تمام داغ و دردِ دل سے کھیلتا چلا گیا

تعلقاتِ ظاہری کو جا بجا سے توڑ کر
یہ ڈورِ آب و خاک کی لپیٹتا چلا گیا

شکست ہو کہ فتح ہو مری روش وہی رہی
گرا اگر کسی جگہ تو ٹیکتا چلا گیا

بڑھا جو دستِ آرزو تو دامنِ نگاہ میں
تمام کائنات کو سمیٹتا چلا گیا

خیالِ مرگ و زیست کو نشور چھوڑتے ہوئے
تمام سرنوشتِ غم کو میٹتا چلا گیا

جیسے کوئی کمسن پوجا کو
پھولوں کی چلے لیکر تھالی

سرشار جوانی کا عالم شانوں پہ لٹیں حلقوں والی
جیسے کہ چڑھے ساون میں اُٹھے بھادوں کی گھٹا کالی کالی

یہ عمر بھی ظالم کیا کہنا، صہبا میں ملے جیسے پارا
ویسے ہی محبت بھی چنچل جیسی کہ جوانی متوالی

مایوس فضاؤں میں دل کو اک آس نے ایسا تڑپایا
جیسے کہ گھٹاؤں کی رُت میں چٹکی لے جگر میں ہریالی

بے یادِ جمالِ یار رہے یوں دل کی بستی سونی سونی
جیسے کہ ہو تنہا راتوں آغوشِ طلب خالی خالی

یوں نذرِ محبت ہوتا ہے رنگیں آغاز جوانی کا
جیسے کوئی کمسن پوجا کو پھولوں کی چلے لیکر تھالی

کھوئی سی تمنا الفت کی یوں پہلے پہل دل میں آئی
جیسے کسی شادی کے گھر میں دولھن اترے بھولی بھالی

احساسِ محبت میں کھو کر یوں دل کو ملامت کرتا ہے
جیسے کہ نشے کے عالم میں دیتا ہو کوئی بہکی گالی

یوں دل کو محبت میں رکھ کر ہوتا ہے سرورِ غم حاصل
جیسے کہ نہا کر اٹھنے پر آنکھوں میں بھرے ہلکی لالی

قدرت بھی نکمّی قوموں کو دنیا سے فنا کر دیتی ہے
جیسے کسی سوکھے پودے کو چلنے میں کچل ڈالے مالی

پھیکا ہے جوانی کا عالم جب دل کی رگوں میں خون نہ ہو
جیسے کہ سحر ہو ہولی کی اور رنگ سے ہو بوتل خالی

یوں وصل کے رنگیں لمحوں کو گھیرے ہوئے ہے تاریکیِ غم
جیسے کہ حنائی ہاتھوں میں چوڑی ہو پڑی کالی کالی

یوں جانِ تمنا سے مل کر آتے ہیں نُشور اُمڈے آنسو
جیسے کہ عدالت کے آگے بیباک ہو مجرم اقبالی

وہ آئے بھی نہیں اور زندگی کی رات جاتی ہے
سحر ہوتی ہے اور شمعِ تمنا جھلملاتی ہے

غزلیات

۱

حقیقت جس جگہ ہوتی ہے تابانی بتاتی ہے
کوئی پردے میں ہوتا ہے تو چلمن جگمگاتی ہے

وہ آئے بھی نہیں اور زندگی کی رات جاتی ہے
سحر ہوتی ہے اور شمعِ تمنا جھلملاتی ہے

ستاروں کا سہارا لے کے دھرتی بیٹھ جاتی ہے
فلک کو دیکھ کر جس دم غریبی مسکراتی ہے

میں دامن تھامتا ہوں اور ادا دامن چھڑاتی ہے
محبت ہے تو کچھ بیگانگی بھی پائی جاتی ہے

مری ناکامیٔ غم ذوقِ حیرانی بناتی ہے
یہ دنیا دور سے میری نظر میں جگمگاتی ہے

سکوتِ وصل کا لمحہ بھی کیا بیدار خوابی ہے
محبت جاگتی ہے اور جوانی سوئی جاتی ہے
وہ جب سنجیدہ ہوتے ہیں ادا انگڑائی لیتی ہے
وہ جب خاموش ہوتے ہیں جوانی گنگناتی ہے
زمانہ ہے کہ دلگیری میں افسردہ سا رہتا ہے
طبیعت ہے کہ غمگینی میں جولانی پہ آتی ہے
ہوائے دامنِ نکہت فزا کا واسطہ تم کو
ذرا ٹھیرے چراغِ زلیست کی لَو تھرتھراتی ہے
مسلسل گلشنِ ہستی میں کانٹے اس نے بوئے ہیں
یہ دنیا پھر انھیں کانٹوں سے کیوں دامن بچاتی ہے
نہ غم فرصت ہی دیتا ہے نہ آنسو بند ہوتے ہیں
برستا جا رہا ہے مینھ بدلی بنتی جاتی ہے

یہی ہستی نشور اک روز ہے انجام ہستی بھی
یہی دنیا کسی منزل پہ عقبیٰ ہو کے آتی ہے

۲

چلمن سے جو دامن کے کنارے نکل آئے
وارفتہ نگاہی کے سہارے نکل آئے
پیمانہ بکف ساتھ تمھارے نکل آئے
ہنگامۂ ہستی سے کنارے نکل آئے
اک سادگیِ حسن کی معصوم ادائیں
رنگین مضامیں کے اشارے نکل آئے
دولت کا فلک توڑ کے عالم کی جبیں پر
مزدور کی قسمت کے ستارے نکل آئے

سب بھول گئے پیچ و خمِ ہوش میں رستہ
اس راہ پہ کچھ عشق کے مارے نکل آئے

سب ڈوب گئے تلخیِ ناکامیِ غم میں
کچھ آپ کے دامن کے سہارے نکل آئے

گستاخیِ باراں سے وہ پیراہنِ پر نم
بھیگے ہوئے جلوؤں سے شرارے نکل آئے

رخصت کے وہ آلنسودہ نگاہوں کی اُداسی
تھی شام مگر صبح کے تارے نکل آئے

آنکھوں میں نظر آنے لگے خون کے آلنسو
اٹھو کہ بس اب سرخ ستارے نکل آئے

رضواں سے بغاوت ہے نشورؔ اور مئے کوثر
عقبیٰ میں بھی کچھ کام ہمارے نکل آئے

۳

فضا پروردۂ عطرِ جوانی ہوتی جاتی ہے
جہاں وہ ہیں وہاں ہر شے سہانی ہوتی جاتی ہے

حیاتِ غم مری دلکش کہانی ہوتی جاتی ہے
محبت انقلابِ زندگانی ہوتی جاتی ہے

سحر اور شام یوں ہی زندگانی ہوتی جاتی ہے
زمانہ بنتا جاتا ہے کہانی ہوتی جاتی ہے

اُدھر وہ کھوئے کھوئے سے اِدھر میں بہکا بہکا سا
محبت بھی شرابِ ارغوانی ہوتی جاتی ہے

وہی ہے ضبطِ غم لیکن اب آنسو آئے جاتے ہیں
وہی ہے دل مگر اب آگ پانی ہوتی جاتی ہے

ہزاروں عالمِ رنگیں کے بعد اک ساعتِ غمگیں
جو باقی ہے وہ میری عمرِ فانی ہوتی جاتی ہے
نہیں معلوم دل کھو کر پھر اپنا حشر کیا ہوگا
جہاں تک دل ہے ان کی مہربانی ہوتی جاتی ہے
گزشتہ الفتوں کا نقش گہرا ہوتا جاتا ہے
جو دنیا مٹ گئی ہے غیر فانی ہوتی جاتی ہے
امنگیں ہیں کہ اب تک ابتدائے آرزو میں ہیں
جوانی ہے کہ یاں ہر لحظہ فانی ہوتی جاتی ہے
نشورؔ اب اور ہی صورت ہو جینے کی تو بہتر ہے
نئی دنیا بھی نظروں میں پرانی ہوتی جاتی ہے

۴

حسرتِ فیصلۂ دردِ جگر باقی ہے
اور ابھی سلسلۂ شام و سحر باقی ہے

آئیے اور نظر سے بھی زمانہ دیکھیں
زندگی ہے تو محبت کی نظر باقی ہے

یا مری صبح میں رونق نہیں ہنگاموں کی
یا مری شام بعنوانِ سحر باقی ہے

نوجوانی گئی انفاس کی خوشبو نہ گئی
پھول مرجھائے مگر بادِ سحر باقی ہے

کوچ ہی کوچ ہے ہر رنگ میں دنیا کی حیات
اک سفر ختم ہوا ایک سفر باقی ہے

یادگارِ حرم و دیر ہے ٹوٹا ہوا دل
شہر ویران ہوا ایک یہ گھر باقی ہے

حسن دل کش ہے جہاں تک ہے تبسم کا ثبات
عشق زندہ ہے اگر دیدۂ تر باقی ہے

بے مے و رنگ ہے کاشانۂ تہذیب جدید
کچھ پسِ پردہ نہیں پردۂ در باقی ہے

زندگی کیا ہے ابھی تجربہ کرنا ہے نشورؔ
شاعری کیا ہے ابھی نقد و نظر باقی ہے

۵

سحر اور شام سے کچھ یوں گزرتا جا رہا ہوں میں
کہ جیتا جا رہا ہوں اور مرتا جا رہا ہوں میں

تمنائے محالِ دل کو جزوِ زندگی کر کے
فسانہ زیست کا پیچیدہ کرتا جا رہا ہوں میں

گُلِ رنگیں یہ کہتا ہے کہ کِھلنا حسن کھونا ہے
مگر غنچہ سمجھتا ہے نکھرتا جا رہا ہوں میں

مرا دل بھی عجب اک ساغرِ ذوقِ تمنا ہے
کہ ہے خالی کا خالی اور بھرتا جا رہا ہوں میں

کہاں تک ارتباطِ جان و جاناں کا تعلق ہے
سنورتے جا رہے ہیں وہ سنورتا جا رہا ہوں میں

جوانی جا رہی ہے اور میں محوِ تماشا ہوں
اُڑی جاتی ہے منزل اور ٹھہرتا جا رہا ہوں میں

بہت اونچا اڑا لیکن اب اس اوجِ تخیل سے
کسی دنیائے رنگیں میں اترتا جا رہا ہوں میں

نشورؔ آخر کہاں تک فکرِ دنیا دل دکھائے گی
غمِ ہستی کو ذوقِ شعر کرتا جا رہا ہوں میں

۶

اپنی دنیا خود بہ فیضِ غم بنا سکتا ہوں میں
اک جہانِ شوق نا محکم بنا سکتا ہوں میں
میری آنکھوں میں ہیں آنسو تیرے دامن میں بہار
گل بنا سکتا ہے تو شبنم بنا سکتا ہوں میں
دل کے باجے میں نہیں معلوم کتنے تار ہیں
حسن کو اک تار کا محرم بنا سکتا ہوں میں
پھر حقیقت کی اسی جنت کی جانب لوٹ کر
بندگی کو لغزشِ آدم بنا سکتا ہوں میں

زندگی کو میں نے بخشی ہے متاعِ صد فریب
راستہ سیدھا ہے پیچ و خم بنا سکتا ہوں میں

حاصلِ اشکِ ندامت کچھ نہیں اس کے سوا
ہے جو دامن تر اسی کو نم بنا سکتا ہوں میں

عشق ہوں میرے لئے پاسِ حدودِ ہوش کیا
ہو کے دیوانہ بھی اک عالم بنا سکتا ہوں میں

جس قدر آنسو گرے اتنا ہی انساں ہو سکا
زندگی شاید بقدرِ غم بنا سکتا ہوں میں

خود شناسی کی شرابِ آتشیں بھر کر نشورؔ
کاسۂ مفلس کو جامِ جم بنا سکتا ہوں میں

۷

بھلاتا ہوں مگر غم کی درخشانی نہیں جاتی
وہ آئینہ مقابل ہے کہ حیرانی نہیں جاتی

نگاہِ شوق سے تا دیر حیرانی نہیں جاتی
شباب آیا تو ظالم شکل پہچانی نہیں جاتی

تجھے دیکھوں کہ تیرے التفاتِ نرم کو سمجھوں
محبت بھی ترے جلوؤں میں پہچانی نہیں جاتی

سحاب و سیل دھو سکتے نہیں گرد فلاکت کو
بہار آئی مگر دنیا کی ویرانی نہیں جاتی

کہاں تک ساتھ دے سکتی ہیں آنکھیں سوزشِ دل کا
بہت رویا مگر غم کی گراں جانی نہیں جاتی

جوانی کو گناہوں سے الگ کرنا نہیں ممکن
یہ وہ مے ہے جو فرطِ کیف سے چھانی نہیں جاتی

محبت تار تار پیرہن کر اپنے کانٹوں سے
کہ ان پھولوں سے میری تنگ دامانی نہیں جاتی

نشورؔ اس وقت بھی دنیا اسیرِ ملک و دولت ہے
ابھی فکر و نظر تا حدِ انسانی نہیں جاتی

۸

کتنا عجیب تر ہے یہ ربطِ زندگانی
ہستی تمام شعلہ عالم تمام پانی
جلوے یہی رہیں گے نظریں یہی رہیں گی
باقی ہے اور رہے گا یہ ارتباط فانی

ہے اک زبانِ الفت ہر پیکرِ محبت
آنسو بھی ترجمانی گیسو بھی ترجمانی

اک لمحۂ تبسم وہ لمحۂ نظر ہے
جس پر کوئی لٹا دے اک عمرِ جاودانی

پھولوں کو تولنا ہے کانٹوں سے کھیلنا ہے
دل کی نزاکتوں میں ان کی مزاجدانی

غم زندگی ہے لیکن شاعر نشورؔ تیرا
نغموں سے کھیلتا ہے جب تک ہے زندگانی

۹

کوئی طوفاں ہو محوِ دوست ہے بزمِ محبت بھی
میں بیٹھا ہوں یہیں کہہ دو گزر جائے قیامت بھی

مزاجِ حسن کچھ برہم ہے دزدیدہ نگاہوں سے
نظر نے چھو لیا ہے جیسے دامانِ نزاکت بھی

یہ ذوقِ شعلہ کے مارے ہوئے آخر کہاں جائیں
جسے کہتے ہیں دوزخ ہے وہ اک پہلوئے جنت بھی

گلستاں کی بہاروں میں زہے تشریف ارزانی
وہ یوں آئے کہ شرما سی گئی پھولوں کی نکہت بھی

شرابِ عیش کے مینا کشو یہ سوچ کر پینا
پسینہ ہے کسی کی موت کا صہبائے عشرت بھی

جوانی حشر ہے جب حسن کا احساس ہو جائے
کہ قامت بھی ہے یہ تخلیقِ رنگیں اور قیامت بھی

عتابِ حسن دلکش تر سہی لیکن ملال ان کا
وہ منظر ہے جہاں نکھرا گئی دل کی حقیقت بھی

جوانیِ گلشنِ عالم کا جز و غیر فانی ہے
یہ وہ گل ہے کہ ہے جس میں مرا رنگِ طبیعت بھی

ادھر جھکتی ہے جس جانب سے بوئے دوست آتی ہے
ترازو ہے شکستِ رنگ کی شاعر کی فطرت بھی

۱۰

حسن جو چودھویں برس آ کے شباب سے ملا
جیسے کہ نغمۂ لطیف کیفِ شراب سے ملا

خوش وہ نہیں خفا سہی "ہاں" وہ نہیں "نہیں" سہی
کانوں کو ایک ذوق تو ان کے جواب سے ملا

پردۂ دل کے اُس طرف جلوۂ بے پناہ ہے
جیسے کہ ہو کھڑا کوئی دل کے حجاب سے ملا

مدرسۂ تصورات غرقِ شرابِ شوق کر
مجھ کو کہ میں ہوں مردِ علم کچھ نہ کتاب سے ملا

آئیں جوانیاں تو بس شورِ گناہ الاماں
جیسے کہ دردِ دل کہیں آتش و آب سے ملا

راز ہے کچھ گریز میں بات ہے کچھ بچاؤ میں
ان کے شباب کا پتہ ان کے حجاب سے ملا

حسن و نظر میں کھو گیا عشق تو فیصلہ ہوا
نشہ شراب میں کھنچا نغمہ رباب سے ملا

فطرتِ غم کی بندشیں روک سکیں نہ عشق کو
حسن و جمال پھوٹ کر شوق و شباب سے ملا

دل جو ٹھہر گیا نشور درد بھی مٹ گیا وہیں
ہائے کہ نقشِ آرزو نقش بر آب سے ملا

۱۱

وہ آئے اس طرف اور یوں بہ طرزِ خوشگوار آئے
اچانک جیسے محفل میں کہیں پھولوں کا ہار آئے

غمِ یار و غمِ ہجر و غمِ آشفتہ سامانی
بہت غم کھا چکے اب کیا غمِ دنیا سے عار آئے

فلک نے چھین لیں رنگینیاں اور لوٹ لی نکہت
مرے اجڑے ہوئے گلشن میں کیا لیکر بہار آئے

لڑکپن کی ادائیں شرمگیں یوں ہوتی جاتی ہیں
کہ جیسے رفتہ رفتہ حسن کے خنجر پہ دھار آئے

وہ انساں کیا جو بیگانہ ہو ذوقِ زخم و خنجر سے
وہ میکش کیا جسے صہبا کی تلخی ناگوار آئے

بتاؤں کیا تجھے حاصل فریبِ زندگانی کا
جو پایا تھا وہ کھو آئے جو جیتا تھا وہ ہار آئے

ابھی ہندوستاں میں انقلاب آیا ہے ایسا ہی
کوئی بہرِ دعا جیسے سرِ لوحِ مزار آئے

محبت کر چکے اب زندگی کا حشر جو کچھ ہو
یہ کشتی ڈوب جائے 'یا رہے' دریا کے پار آئے

نگاہیں کیا ملیں خوابیدہ اندازوں نے کروٹ لی
قیامت سو رہی تھی جیسے ہم جا کر پکار آئے

نشورؔ اب زندگی پیمائشِ غم کے سوا کیا ہے
شبِ رخصت اگر گزرے تو شامِ انتظار آئے

۱۲

میں نظر نظر پہ مچل گیا میں قدم قدم پہ ٹھہر گیا
تری کائنات شباب میں میں جوان ہو کے جدھر گیا

یہ خرام ناز پہ مٹ گیا وہ شباب عمر پہ مر گیا
جو جوانیوں سے گزر گیا وہ قیامتوں سے گزر گیا

دل و دلربا کا وہ ساتھ ہے کہ اڑے تو دونوں ہی اڑ گئے
مری آہ تا بہ فلک گئی ترا حسن تا بہ قمر گیا

میں یہ کہہ رہا ہوں جہاں کو مجھے خال و خط کی خبر نہیں
ترا حسن دے کے نظر گیا ترا جلوہ لے کے نظر گیا

یہ زمیں بھی تھی یہ فلک بھی تھا مگر اک شباب کی تھی کمی
تری زلف تا بہ کمر گئی تو جہانِ حسن سنور گیا

ہے جمالِ یار میں جس طرح جزر و مد جو مثالِ نغمۂ زیر و بم
یہ تغیراتِ شباب ہیں یہ نشہ نہیں کہ اتر گیا

مری رات آج وہ رات ہے کہ قمر نہیں کہ سحر کروں
مری رات ایک وہ رات تھی کہ سحر ہوئی تو قمر گیا

یہ محبتوں کی نظر ہے کیا کہ نشورؔ ایک نگاہ میں
جو طرب فزا تھا ابھی ابھی وہی نغمہ درد سے بھر گیا

۱۳

نئی دنیا مجسم دل کشی معلوم ہوتی ہے
مگر اس حسن میں دل کی کمی معلوم ہوتی ہے

حجابوں میں نسیم زندگی معلوم ہوتی ہے
کسی دامن کی ہلکی تھرتھری معلوم ہوتی ہے

محبت اک مسلسل بدظنی معلوم ہوتی ہے
کہ ان سے ہر ملاقات آخری معلوم ہوتی ہے

مری راتوں کی خنکی ہے ترے گیسوئے پُرخم میں
یہ بڑھتی چھاؤں بھی کتنی گھنی معلوم ہوتی ہے

وہ اچھا تھا جو بیڑا موج کے رحم و کرم پر تھا
خضر آئے تو کشتی ڈوبتی معلوم ہوتی ہے

غریبوں کے لہو سے اس طرح سونا بناتے ہیں
یہ جنگِ عصر جنگِ زرگری معلوم ہوتی ہے

یہ دل کی تشنگی ہے یا نظر کی پیاس ہے ساقی
ہر اک بوتل جو خالی ہے بھری معلوم ہوتی ہے

دمِ آخر مداوائے دلِ بیمار کیا معنےٰ
مجھے چھوڑو کہ مجھ کو نیند سی معلوم ہوتی ہے

دیا خاموش ہے لیکن کسی کا دل تو جلتا ہے
چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے

نسیمِ زندگی کے سوز سے مرجھائی جاتی ہے
یہ ہستی پھول کی اک پنکھڑی معلوم ہوتی ہے

جدھر دیکھا نشورؔ اک عالمِ دیگر نظر آیا
مصیبت میں یہ دنیا اجنبی معلوم ہوتی ہے

۱۴

میں نے کبھی نظر نہ کی دلکشیِ حیات پر
میری تمام زندگی ان کی جمالیات پر

مجھ کو حیات کے سوا چاہیے اک غمِ حیات
طبعِ غم آفریں مری رہ نہ سکی حیات پر

وہ بھی غیور و شرمگیں دل بھی نزاکت آفریں
چوٹ لگی ہے بات سے بات بڑھی ہے بات پر

چاند ہے اور چاندنی حسن ہے اور حُسنِ یار
میرے ہزار دن نثار حُسن کی ایک رات پر

حسن یہاں نظر فریب درد یہاں جگر گداز
ہائے کہ مٹ گیا نشورؔ جلوۂ بے ثبات پر

۱۵

بھلا کب دیکھ سکتا ہوں کہ غم ناکام ہو جائے
جو آرامِ دل و جاں ہے وہ بے آرام ہو جائے

محبت کیا اگر یوں صورتِ الزام ہو جائے
نظر ناکام اور ذوقِ نظر بدنام ہو جائے

قیامت ہے اگر یوں زندگی ناکام ہو جائے
وہ پہلو میں نہ ہوں اور گرمیوں کی شام ہو جائے

فضا رنگیں فضا اور شام رنگیں شام ہو جائے
وہ آجائیں تو ساری چاندنی گلفام ہو جائے

غمِ دل ہے مگر آخر غمِ دل کیا کہے کوئی
فسانہ مختصر ہو کر جب ان کا نام ہو جائے

محبت رو چکی اور ماتمِ انجام باقی ہے
وہ آنکھیں اشک بھر لائیں تو اپنا کام ہو جائے

بڑی حسرت سے انساں بچپنے کو یاد کرتا ہے
یہ پھل پک کر دوبارہ چاہتا ہے خام ہو جائے

میں ضبطِ غم میں بھی اک کیفیت کا ذوق رکھتا ہوں
میں پی جاؤں اگر یہ اشک رنگیں جام ہو جائے

مری دنیا کی تاریکی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے
قمر طالع ہو یا سورج قریبِ بام ہو جائے

جیا لیکن مرا جینا کسی کے بھی نہ کام آیا
میں مرتا ہوں کہ شاید زندگی پیغام ہو جائے

نشورؔ احباب خوش دل کو ذرا ہنس بول لینے دو
قیامت ہے اگر احساسِ شاعر عام ہو جائے

۱۶

کیا چیز ہے محبت عالم کے خشک و تر میں
رس بھر دیا ہے جس نے بیتابیٔ نظر میں

جب دل کی دھڑکنوں کا پردا اٹھا کے دیکھا
ٹھیرا ہوا تھا دل اور ہر ذرہ تھا سفر میں
اس خاک کی کلی میں کل عطرِ آب و گل ہے
دنیا نچوڑ لی ہے اک خلقتِ بشر میں
دو پاک ہستیوں میں کیا چیز ہے محبت
دل کھینچ کے آگیا ہے دونوں طرف نظر میں
فطرت جگا رہی ہے کمسن جوانیوں کو
سویا ہوا ہے محشر اک حسنِ بے خبر میں
تم کیا گئے کہ جیسے دنیا بدل گئی ہے
سورج وہی ہے لیکن رونق نہیں سحر میں
گہرائیوں میں دل کی بیشک اتر گیا ہے
اک شعر اگر کہا ہے شاعر نے عمر بھر میں

۱۷

محبت ہوش سے گزری تو کچھ دیوانگی آئی
جگر میں درد اٹھا اشک ٹپکے کچھ ہنسی آئی

شکستِ ناز فرمائی ہے یا تکمیلِ رعنائی
ادائیں محوِ الفت ہو گئیں یا سادگی آئی

خدائی مل رہی تھی لیکن اس انساں نے ٹھکرایا
کچھ ایسا جلوہ لے کر اس کے آگے بندگی آئی

مجھے محسوس کرنا ہی پڑا ارلیطِ جمال ان کا
یہاں تک میرے نقشِ آرزو میں دلکشی آئی

تو سجدے مانگتا ہے اور میں مغرورِ طاعت ہوں
خدائی تجھ کو آئی اور نہ مجھ کو بندگی آئی

جہاں سے عشق نے سنجیدگی برتی غمِ دل میں
وہیں سے کچھ مزاجِ حسن میں آشفتگی آئی

نشورؔ اک زندگی کا تجربہ ہے شعر موزوں بھی
بہت دیکھے غمِ ہستی تو تھوڑی شاعری آئی

بادۂ خام

میں شاد ہوں تو زمانے میں شادمانی ہے
شراب لاؤ کہ عالم تمام فانی ہے

۱

میں شاد ہوں تو زمانے میں شادمانی ہے
شراب لاؤ کہ عالم تمام فانی ہے
تمام عالمِ ہستی پہ حکمرانی ہے
ہرا جہان ہے جب تک مری جوانی ہے
رگوں میں روح ہے اور خون میں روانی ہے
نگاہ بادہ کش و چہرہ ارغوانی ہے
تغیرات کے عالم میں زندگانی ہے
شباب فانی نظر فانی حسن فانی ہے
کہیں کہیں یہ محبت بھی غیر فانی ہے
جہاں خیال حقیقت کی ترجمانی ہے

فریبِ حسن و جوانی سے رو کنے والے
میں کیا کروں کہ قیامت کی دلستانی ہے
ترے خیال سے ہے مستیِ نظر میری
تری نگاہ سے میں نے شراب چھانی ہے
ترا جمال فسانوں میں رنگ بھرتا ہے
ترے شباب سے دلکش مری کہانی ہے
مری حیات میں جب تو نہیں تو کچھ بھی نہیں
ترے بغیر بھی کیا خاک زندگانی ہے
دلِ فسردہ میں ہوتی ہے زندگی پیدا
نشور جرعۂ صہبا بھی زندگانی ہے

۲

بے کیفیِ شبِ مہ کی اجالی نظر آئی
بوتل جو مئے ناب سے خالی نظر آئی

ہلکی سی جو ان آنکھوں میں لالی نظر آئی
میں کیا کہوں دل لوٹنے والی نظر آئی

محویتِ دیدار میں آئینہ جو دیکھا
مجھ سی نہ مری شکل مثالی نظر آئی

یاد آگئی بیتی ہوئی اک شب کی ملاقات
لہرا گیا میں رات جو کالی نظر آئی

کعبہ میں بھی اس حسنِ ستمگار نے مارا
سجدوں میں بھی ابروئے ہلالی نظر آئی

بھیگی ہوئی زلفوں میں وہ اترا ہوا چہرہ
ساون کی گھٹاؤں میں اجالی نظر آئی

وہ دوش، وہ بازو، وہ سر انگشت حنائی
جو چیز تھی سانچے ہی میں ڈھالی نظر آئی

اک صبح غم انگیز نشور آئی تو جیسے
دنیا مجھے امید سے خالی نظر آئی

۳

ظرفِ خیالِ یار بھی لبریز ہو گیا
مدت کے بعد پی تو نشہ تیز ہو گیا

آنکھوں میں ایک رنگ گلابی سا آ گیا
چہرہ سرورِ جام سے گلبیز ہو گیا

ہستی تمام جام میں ڈھلتی چلی گئی
عالم تمام کیف سے لبریز ہو گیا

یوں کیفِ مے نشاطِ جوانی سے مل گیا
جیسے کہ رنگ رنگ میں آمیز ہو گیا

ہر اک نظر شباب کے جلووں میں گھر گئی ہر منظر جمال بلاخیز ہو گیا
جیسے رگوں میں شعلۂ آتش سما گیا
جیسے نفس نفس شرر انگیز ہو گیا

۴

شوق تھا شباب کا حسن پر نظر گئی
لٹ کے تب خبر ہوئی زندگی کدھر گئی
بارگاہِ حسن میں جب کبھی نظر گئی
رک گئی سنبھل گئی تھم گئی ٹھہر گئی
دیکھتے ہی دیکھتے آگئیں جوانیاں
رس بھرا شباب میں زلف تا کمر گئی

نقطۂ نگاہ سے محشرِ خیال تک
کُل تری یہ کائنات آرزو سے بھر گئی

کیوں سکوں نصیب ہیں ہجر کی درازیاں
جیسے پیاس بجھ گئی جیسے بھوک مر گئی

دیکھتے ہی دیکھتے دن گئے بہار کے
فصلِ گُل بھی کس قدر تیز تر گزر گئی

زندگی قریب ہے کس قدر جمال سے
جب کوئی سنور گیا زندگی سنور گئی

داستانیاں بڑھیں نوجوانیاں چڑھیں
ذرّہ ذرّہ زندگی پھوٹ کر ابھر گئی

دن بدل گئے مگر غم بدل سکا نہیں
دل رہا دلِ حزیں، چشم چشمِ تر گئی

کیا خبر نشورؔ تھی منزلِ شباب کی
پھول لے لیا مگر نوکِ خار اُتر گئی

۵

ایک مستِ شباب باقی ہے
چلتی پھرتی شراب باقی ہے

نشۂ کامیاب باقی ہے
دورِ برف و شراب باقی ہے

خانۂ خام و گوشۂ صحرا
یار و عہدِ شباب باقی ہے

فکرِ تعمیرِ دو جہاں بے سود
اک جہانِ خراب باقی ہے

حیف بیداریِ خیال و نظر
عالمِ نیم خواب باقی ہے

گیس اور بجلیوں کی حد سے دُور
اک شبِ ماہتاب باقی ہے

اک خدائے جہاں رحیم و کریم
بے گناہ و ثواب باقی ہے

ماورائے نشورؔ عالمِ خاک
ایک رنگین خواب باقی ہے

٦

ملاحت جوانی تبسم اشارا　　انھیں کافروں نے تو شاعر کو مارا

محبت بھی ظالم عجب بے بسی ہے　　نہ وہ ہی ہمارے نہ دل ہی ہمارا

میں تنکوں کا دامن پکڑتا نہیں ہوں　　محبت میں ڈوبا تو کیسا سہارا

مجھے سطحِ غم پر ابھی تیرنے دو　　میں ڈوبا تو ڈوبا تغزل کا تارا

جو بسمل بنا دے وہ قاتل تبسم　　جو قاتل بنا دے وہ دلکش نظارا

محبت کا بھی کھیل نازک ہے کتنا　　نظر مل گئی آپ جیتے میں ہارا

تمھاری امنگوں کا کیا پوچھنا ہے　　بہاریں تمھاری گلستاں تمھارا

تمھارا نشور اور تمھارا تخیّل
محبت تمھاری تو شاعر تمھارا

۷

جب سے کہ عمر آئی ہے ان کے شباب کی
دنیا بدل گئی ہے جہانِ خراب کی
تابانیاں میں عرض کروں کیا شباب کی
سانچے میں ڈھل گئی ہے کرن آفتاب کی
تھی کمسنی تو رنگِ گلستاں تھا حسن دوست
معصومیت میں مار نہیں تھی حجاب کی
آتا ہے ایک رنگ تو جاتا ہے ایک رنگ
آنکھوں میں موج کھیل رہی ہے شراب کی
بازو برہنہ، زلف مسلسل، بھویں سیاہ
آنکھوں میں کیف چال میں مستی شراب کی

اک پیکرِ شباب کا خاموش التفات
ہونٹوں پہ جیسے مہر لگی تھی گلاب کی
شاید کسی کا دردِ محبت جگا سکے
ظالم کو نیند آئی ہے عہدِ شباب کی

۸

نظروں میں کامرانی جلوؤں میں حکمرانی
ہے مالکِ زمانہ اک مالکِ جوانی
اک فرصتِ نظارا اک پیکرِ جوانی
اس کے سوا دو عالم میری نظر میں فانی
یہ ممکناتِ باطل یہ کائناتِ فانی
ہستی سے تو بدل دے اک لمحۂ جوانی

ساغر میں اور کچھ ہے آنکھوں میں اور ہی کچھ
وہ مستیٔ زمانہ یہ مستیٔ جوانی

ظالم شراب بھی ہے کتنی لطیف تر شے
دو گھونٹ پیتے پیتے چہرہ ہو ارغوانی

اے زندگی سے غافل ہے زندگی بس اتنی
وہ ایک لمحہ بچپن دو چار دن جوانی

۹

پھاگن میں بھی جو ابر اٹھا او چھا گیا　　میں کیا کہوں کہ کون مجھے یاد آگیا
گزرا ہوا خیال اک آکر چلا گیا　　جیسے کہ کوئی مجھ کو سنیما دکھا گیا
جلوؤں کا انتشار نگاہوں پہ چھا گیا　　موسم کا انقلاب رگوں میں سما گیا
اب کیا ہے ان کے حسن کی تخئیل کے سوا　　عالم تمام ان کی جوانی میں آگیا
پھولوں سے میں بچا نہ سکا اپنے آپکو　　کانٹوں سے تو نشوؔر میں دامن بچا گیا

۱۰

میں بے نیازِ رنگ ہوں رنگِ جہاں سے دُور
گل سے الگ چمن سے جدا گلستاں سے دُور

تھوڑی سی میکدے کے لئے چاہیئے زمیں
دنیا کے اس بنائے ہوئے آسماں سے دُور

میں جلوۂ تمام ہوں میں غفلتِ مدام
سارا سماں مجھی میں مگر میں سماں سے دُور

یوں آرہا ہے عہدِ گزشتہ کا کچھ خیال
جیسے کوئی ستار بجائے یہاں سے دُور

چوکھٹ سے آ رہو ہے جبینِ نیاز کی
سجدہ کہاں رہے گا ترے آستاں سے دُور

۱۱

دنیائے رنگ و بو سے گزرتا ہوں میں کبھی
رنگینیٔ شباب پہ مرتا ہوں میں کبھی

پھولوں کو چھو کے آہ سی بھرتا ہوں میں کبھی
دل کی نزاکتوں سے گزرتا ہوں میں کبھی

نظارۂ جمال کے نزدیک بیٹھ کر
بیتابیِ نگاہ سے ڈرتا ہوں میں کبھی

جیسے کہ اک نمود سی باقی ہے کچھ ابھی
آشفتہ حالیوں میں سنورتا ہوں میں کبھی

میرے تخیلات کو چنتی ہے کائنات
عالم میں پھول بن کے بکھرتا ہوں میں کبھی

مجھ میں بھی اک کشش ہے انھیں کے جمال کی
ان کی تجلیوں سے نکھرتا ہوں میں کبھی

دنیائے شعریت لئے شاعر کی شکل میں
ہر دل کی چوٹ بن کے ابھرتا ہوں میں کبھی

بوتل کی مے نشور گراتے ہوئے تمام
پیمانہ چشمِ مست سے بھرتا ہوں میں کبھی

۱۲

قامتِ دلربا پہ شباب آگیا — یا سوا نیزے پہ آفتاب آگیا
جاگی جاگی ان آنکھوں کا عالم نہ پوچھ — سامنے ایک جامِ شراب آگیا
اک نگاہِ محبت کی تخمیر میں — سب سمٹ کر جہانِ خراب آگیا
یہ چلے وہ بڑھے وہ جواں ہو گئے — چند لمحوں میں یوم الحساب آگیا

جھوم اٹھی ایک ارماں بھری زندگی　　جب ہوائیں چلیں جب سحاب آگیا

آئیے آئیے اس طرف وہ نشورؔ
شاعرِ یادگارِ شباب آگیا

۱۳

آغوشِ رنگ و بو کے فسانے میں کچھ نہیں
حسرت نکل گئی تو زمانے میں کچھ نہیں

مایوسیوں میں حُسن بھی روشن نہیں رہا
دل بجھ گیا تو شمع جلانے میں کچھ نہیں

ساقی کے کیفِ بادۂ پارینہ کی قسم
سائنس کے جدید خزانے میں کچھ نہیں

اک حسنِ نیمخواب کا عالم ہی اور ہے
سوئی ہوئی ادا کو جگانے میں کچھ نہیں

فطرت نئی زمانہ نیا، زندگی نئی
کہنہ خدا کو پوجتے جانے میں کچھ نہیں
تیرا ہی ایک عکس تھا ہر سو نظر فریب
دیکھا تو میرے آئینہ خانے میں کچھ نہیں
کچھ ذکرِ جام و شاہد و مے کیجئے نشورؔ
ہوش و خرد کے سرد فسانے میں کچھ نہیں

۱۴

زندگی ایک راز ہے پیارے — اختلافِ مجاز ہے پیارے
خلق آلودۂ گناہ سہی — زندگی پاکباز ہے پیارے
زندگی دلشکن نہیں ہوتی — زندگی دلنواز ہے پیارے
روح کو جسم سے الگ کرنا — یہ بھی اک امتیاز ہے پیارے
ان کی زلفِ دراز جب تک ہے — زندگی بھی دراز ہے پیارے

۱۵

ہاتھ سے دنیا نکلتی جائے گی — اور دنیا ہاتھ ملتی جائے گی

حسن کی رنگت بدلتی جائے گی — یہ شبِ مہتاب ڈھلتی جائے گی

منقلب ہوتی رہیں گی فطرتیں — زندگی کروٹ بدلتی جائے گی

ختم ہو سکتی نہیں سیرِ حیات — زندگی رک رک کے چلتی جائے گی

نوجوانی آرزوئیں سب لئے — گرتی جائے گی سنبھلتی جائے گی

عشقِ غافل زخم کھاتا جائے گا — حسن کی تلوار چلتی جائے گی

یوں ہی اک ارماں نکلتا جائیگا — یوں ہی اک حسرت مچلتی جائے گی

یوں ہی آتی جائے گی شامِ وصال — یوں ہی شمعِ بزم جلتی جائے گی

یوں ہی رخصت ہوتی جائیگی خوشی — یوں ہی صبحِ غم نکلتی جائے گی

یوں ہی گائے جائیں گے شعرِ نشورؔ
یوں ہی طبعِ غم بہلتی جائے گی

۱۶

جب ظلمتیں شعاع بداماں سی ہو گئیں
آنکھیں کسی کی کھل کے پشیماں سی ہو گئیں
رعنائیاں تمام نمایاں سی ہو گئیں
زلفیں کھلیں تو کھل کے پریشاں سی ہو گئیں
برہم نگاہیوں نے جو اپنے پہ کی نظر
شمعیں حیا کی رُخ پہ فروزاں سی ہو گئیں
بہکے ہوئے شباب کی بیتابیاں تمام
کپڑوں کی سلوٹوں سے نمایاں سی ہو گئیں
کچھ ماجرائے شوق کے رنگیں خیال سے
نظریں ملیں تو مل کے گریزاں سی ہو گئیں

۱۷

جب سے کہ رُت بسنت کی جاڑوں میں آئی ہے
سرسوں کے ساتھ وں کی فضا لہلہائی ہے

یہ امتزاجِ حسن و عالم دہائی ہے
بدلی بھی چھائی، اور جوانی بھی چھائی ہے

سرتاقدم شباب کی تنویر چھائی ہے
جیسے کہ آب و گل میں کرن پھوٹ آئی ہے

تابِ نظارۂ گل و گلشن نہیں مجھے
جیسے کہ چوٹ میں نے تبسم سے کھائی ہے

ہر جلوہ کائنات کا محو سجود ہے
میں تو یہی کہوں گا جوانی خدائی ہے

دل میں نہیں تڑپ تو نگاہوں میں کچھ نہیں
دل کی تجلیوں سے نظر جگمگائی ہے

۱۸

یوں ہی ٹھہر ٹھہر کے میں روتا چلا گیا
موتی سنبھل سنبھل کے پروتا چلا گیا
سانچوں میں حسن و لوز کے ڈھلتا گیا شباب
سرتا قدم شراب ہی ہوتا چلا گیا
دشمن نے میری راہ میں کانٹے بچھا دیئے
اور میں اٹھا تو پھول ہی بوتا چلا گیا
ہر نقشِ آرزو جو بعنوانِ ہوش تھا
جیسے کوئی شراب سے دھوتا چلا گیا

جھولا جھلا رہی تھی مجھے دل کی آرزو
سب جاگتے تھے اور میں سوتا چلا گیا

رنج و ملال و کیف و نشاط و بہارِ عمر
جو کچھ مجھے ملا اُسے کھوتا چلا گیا

غم کا خموش نغمۂ دلسوز بھی نشورؔ
اک کیف سا رگوں میں سموتا چلا گیا

۱۹

رنگ یہاں بہت مگر رنگ سے کام بھی نہیں
تیری یہ بزم آب و گل دل کا مقام بھی نہیں

بس کہ کہیں نہ جاگ اُٹھیں سوئی ہوئی قیامتیں
یہ تو خرام حشر ہے حشر خرام بھی نہیں

میری نمازِ کیف میں سجدہ کہاں رکوع کیا
ساقیِ مست کی قسم ہوش امام بھی نہیں

حسن تمام گفتگو عشق تمام خامشی
رفعِ شکوک بھی نہیں قطعِ کلام بھی نہیں

مے سے اگر گریز ہے سجدہ تو خم کو کیجئے
بادہ حرام ہو تو ہو سجدہ حرام بھی نہیں

شوقِ شباب نو بہ نو ذوقِ گناہ دمبدم
عمر تمام ہو تو ہو لطف تمام بھی نہیں

جلوۂ حسن مضطرب، نورِ نگاہ بے قرار
آنکھ کہاں ٹھہر سکے حسن مقام بھی نہیں

کوئی بھی ہو لگائے دل کوئی بھی ہو جلائے دل
عشق کی بارگاہ میں منعِ عوام بھی نہیں

جب بھی ہو مجھ کو ہوش سے بس ہے وہی سحر مری
زندگی صبح بھی نہیں زندگی شام بھی نہیں

آپ کی زندگی نشورؔ آپ کی شاعری نشورؔ
حسن تمام حسن ہے صوت و کلام بھی نہیں

تنقیدی سرمایہ

از پرنسپل شکور

اُردو ادب کا قدیم سرمایۂ تنقید چند تذکرات پر مشتمل ہے موجودہ تنقید کی ابتدا آزاد ، حالی اور شبلی کے ان کارناموں سے ہوئی جو آج تاریخی اہمیت رکھتے ہیں - آزاد کی آب حیات اُردو ادب کا گراں بہا سرمایہ ہے - بیسویں صدی کے آغاز سے اُردو تنقید کا نیا دور شروع ہوتا ہے اور انگریزی زبان کے ادب تنقید اور نیز نئے رجحانات کے ماتحت اس صنف میں نمایاں اضافہ ہوتا ہے - رام بابو سکسینہ ، حامد حسن قادری ، نیاز فتحپوری ، کلیم الدین احمد ، فراق گورکھپوری ، مجنوں گورکھپوری اس نئے دور کے بہترین نقاد اور ترجمان ہیں -

"تنقیدی سرمایہ" کے مصنف نے نصف صدی سے زیادہ ع
کے چھوٹے بڑے تمام تنقیدی کارناموں کا جائزہ لیا ہے او
رجحانات پر ہمت افزا روشنی ڈالی ہے -

تبصرہ نگاروں ، نقادوں اور ادب پرستوں کے لئے یہ کتاب ادبی شاہراہ کا کام دیگی -

اُردو کے تنقیدی سرمایہ کی بہترین تار...

قیمت دو روپیہ

کتاب محل - پبلشرس - الہ آباد

صرف کور کرشن پریس الہ آباد میں چھپا